ہم اور وہ

ہم اور وہ

خواجہ محمد شفیع

بارِ چہارم

قیمت عہ۸/

مکتبۂ ادب اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

جناح پریس، دہلی

دیباچہ

جب سے ہوش سنبھالا بڑے بوڑھوں سے پیش رفتگان کی تعریف و توصیف میں قصیدہ سنتے سنتے تھک گئے۔ اور اپنی ہجو سنتے سنتے ناک میں دم آگئی کان پک گئے نہ قصیدہ ختم ہوتا ہے نہ ہجو۔ اگر غور سے دیکھئے تو نہ قصیدہ میں کوئی مدعا نہ ہجو میں کچھ معنی۔ حقیقتاً قصیدہ مردہ پرست ذہنیت کا نتیجہ ہے اور ہجو خبث نفس کا۔

ہم بزرگ داشت کے تحت یہ بھی انگیز لیتے لیکن اندیشہ ہے کہ بُرا سنتے سنتے ہم کہیں بُرے نہ ہو جائیں۔ وقت آگیا ہے کہ اس لن ترانی کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جائے کہ ہمنوا ہیں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں !

ہم کو گُل نہیں بننا ہم بہت خوار ہو چکے۔ اب ہم کو خار بننا ہے۔ اگر گل بنینگے تو قبروں پر چڑھائے جائینگے۔ خاک میں ملجائینگے۔ خار خود بھی محفوظ رہتا ہے اور دوسروں کی بھی حفاظت کر سکتا ہے۔

بڑے بوڑھوں کی باتیں اکثر قصہ کہانیوں کی سی ہوتی ہیں اس وجہ سے میں نے اس مقالہ کی ابتدا کہانی کی طرز پر کی ہے ؂

اس کتاب کی بابت مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے

"قدیم" "و جدید" کی بحث اب خود ختم ہو چکی ہے۔ اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی۔ اس پر بھی جب کوئی زندہ شخصیت اس میں حصہ لیتی ہے۔ تو بحث کی مردہ ہڈیوں میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے۔ مدت سے کہا یہ جا رہا تھا کہ دلی اب دلی والوں سے خالی ہو گئی۔ اور زباں دانی اس خطہ سے رخصت ہو گئی۔ تم اور وہ نے ثابت کر دیا کہ دلی میں دلی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں۔ اور دلی کی زبان اب بھی ماشاءاللہ اسی آب و تاب سے اُسی آن بان سے زندہ ہے۔ قائم و پائندہ ہے۔ درخشاں و تابندہ ہے۔ مصنف نے ایک اچھوتے طرز پر قدیم و جدید کی بحث کو اٹھایا ہے۔ اور محاکمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ نتائج تک پہونچتے پہونچتے ممکن ہے کہ قلم کا رخ کہیں کہیں غلو و مبالغہ کی جانب جھک گیا ہو۔ لیکن بحیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے، سچی، کھری، سیدھی، خدا لگتی۔ اور حسن بیان و لطف و زباں کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ۔ فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی، اور بلاغت قدم قدم پر نثار ہوتی جاتی ہے۔ حسن انشا کا ایسا نمونہ دیکھنے کو تو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں اللہ ان کی عمر میں بہت بہت برکت، اُن کے قلم کو بہت بہت قوت عطا کرے کہ گلشن اردو کو ایسی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں تک باقی رہے گی۔

مدتیں گذریں زمانے ہوگئے۔ ایک سپاہی بچہ تلاش معاش میں گھر سے نکلا۔ نہ سُدھ بُدھ کی اور نہ منگل کی لی۔ راہ کی عمر کوتاہ اور چلنے والے کی عمر دراز۔ چلاچل۔ چلاچل دن سارا گذر گیا۔ رات ہونے آئی۔ آسمان کا مسافر سُرخ رو سرائے مغرب میں داخل ہوا۔ سپاہی بچہ بھی ایک کنوئیں کی مینڈھ پر ہو بیٹھا۔ کمر سے روٹی کھولی۔ نوالہ توڑا تھا کہ کوّے نے کائیں کائیں کی۔ ٹکڑا ڈال دیا۔ کوا اُڑا اور دم کے دم میں پھر موجود۔ اتنے میں سپاہی نے دوسرا نوالہ اُٹھایا اور اُس نے اپنی صدا لگائی۔ ہاتھ کا سخی دل کا غنی تھا، یہ نوالہ بھی کوّے کو ڈالا۔ ابھی تیسرا نوالہ توڑنے نہ پایا تھا کہ وہ ناخواندہ مہمان آن کھڑا ہوا۔ سپاہی بچہ کو غصہ آیا اور بولا۔ یہ روسیاہ کوا بھی بڑا بے صبرا جانور ہے۔ غضب خدا کا اس کو دو نوالہ ڈال چکا ہوں۔ میں نے ابھی ایک لقمہ بھی نہیں کھایا اور یہ کمبخت کان کھائے جاتا ہے۔ کوّے نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی کہ اس وقت میری قوم پر بات آرہی ہے۔ مجھے ایک دو گھڑی کو زبان عطا کر کہ اس سپاہی بچہ سے دو دو باتیں کروں، سچّے وقت تھے سچے زمانے۔ کوّے کی دعا قبول ہوئی۔ وہ آگے بڑھا اور بولا میاں سپاہی میں بے صبرا نہیں ہوں۔ ان دونوں ٹکروں میں سے اگر ایک بھور ابھی میرے منھ میں گیا ہو تو بُری سُنئے گئی ہاں لیجانے کا گناہگار ضرور ہوں۔

سپاہی نے کہا تو پھر تونے وہ ٹکڑے سینت کر رکھے ہوں گے۔ کوّے نے جواب دیا نہیں پہلا ٹکڑا تو میں نے اپنے اپاہج باپ کو دیا جس کی عمر چار سو برس کی ہے۔ دوسرا اپنے بے ماں کے بچوں کو دے آیا۔ اب اگر تم کچھ دو گے تو میرے منہ پڑے گا۔ سپاہی نے ایک ٹکڑا اور ڈالا۔ اور کوا وہیں بیٹھ کر ٹھنگیانے لگا۔ شدہ شدہ ان دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ سپاہی بچہ بولا۔ میاں کوّے کوئی اگلے وقتوں کا ذکر کرو۔ جو رات کٹے۔ کوّے نے جواب دیا۔ میرے باپ نے بیس بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے۔ اس کو بڑی بڑی باتیں یاد ہیں۔ اگر تمھاری خوشی ہو تو اس کے پاس چلو رات بھر تمھیں قصہ سناتا رہیگا۔ دو قدم پر گھونسلا تھا۔ یہ دونوں وہاں جا پہنچے کوّے نے اپنے باپ سے کہا کہ اس سپاہی بچہ نے ہم کو روٹی دی ہے۔ اگلے وقتوں کے ذکر سُننے چاہتا ہے۔ بڈھا کوا بولا میاں جوان

پرانے زمانے کے اچھوں کا ذکر سناؤں یا بروں کا۔ سپاہی نے جواب دیا۔ باباجی جن کا تمھارا دل چاہے۔ کوّا بولا۔ میاں اچھے تو اچھے ہوتے ہی تھے تم بروں کی باتیں سُنو۔

ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ اگلے وقتوں میں ایک بادشاہ راتوں کو بھیس بدل اپنی رعایا کا حال دیکھنے گداگری کو نکلا کرتا تھا۔ ایک رات ہونی شدنی بات بادشاہ ٹہلتا ٹہلتا دریا کنارے جا نکلا دیکھتا کیا ہے کہ سات چور کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک بولا خبر رساں نے خبر دی ہے کہ ٹھیک رات کے آدھی بجے ایک نعش بہتی ہوئی آئے گی۔ اور اس کے سینہ پر بیش بہا لال ہوگا۔ سرغنہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارہ بجا چاہتے ہیں۔ اتنے میں دور سے دریا میں ایک سفید سفید چیز آتی دکھائی دی۔ جب قدرے قریب آئی تو ایک نے اشارہ پاکر پانی میں چھال ماری اور نعش کو پکڑ کنارے پر لایا۔ سردار نے خنجر سے کفن چاک کیا سینہ پر ایک دہکتا ہوا انگارہ سات بادشاہتوں کی قیمت لعلِ شب چراغ رکھا تھا۔ نعش کو دریا میں پھر بہا دیا۔ اب سرغنہ نے لعل ہاتھ میں لے ساتھیوں سے پوچھا۔ آج ہم نے کس کی چوری کی۔ ساتھی یک زبان ہوکر بولے۔ مردہ کی۔ سردار نے لعل دریا میں پھینک دیا۔ اور کہا مرد مردے کی چوری نہیں کیا کرتے۔ سُو میاں صاحبزادے۔ بھلوں کا کیا پوچھنا۔ اُس زمانے کے بُرے بھی اچھے ہوتے تھے۔

جوان کوّے نے جب یہ بات سُنی تو موجودہ زمانہ کی حالت پر اُسے افسوس ہوا اور دو آنسو ٹپک پڑے۔ ایک کالا اور ایک سفید۔ چشمِ خرد نے جب ان پر نظر ڈالی تو وہ آنسو ایک کتاب کی شکل میں نظر آئے جس کا ایک ورق سیاہ اور ایک سفید تھا۔ ورقِ سیاہ پر جلی قلم سے لکھا تھا" دی روز" اور صفحۂ سفید پر " فردا " تحریر تھا۔

سرِ ورق پر" ہم اور وہ " لکھا تھا۔

اب مغرب کی جانب سے ایک ہوا آئی اور صفحہ اُلٹنے شروع ہوئے۔ پہلے پر موٹے بیل کے بڑے بڑے "دیدے" نظر آئے۔ دوسرے پر" دور کے ڈھول سہاونے" تحریر تھا۔

اب جو ورق اُلٹا تو صفحہ سیاہ پر سفید پوش بزرگ نظر آئے۔ سامنے ایک نوجوان خستہ حال زبوں صورت سر جھکائے بیٹھا ہے۔ منہ پر سات قفل پڑے ہیں اوپر سے مہریں ثبت۔ ان پر کندہ ہے۔ خوش اعتقادی مردہ پرستی۔ بزرگ داشت۔ رسم و رواج۔ لاعلمی اور جہالت۔ علم دشمنی تنگ نظری۔ بڑے میاں بیکار رہے ہیں اور نوجوان سہمہ تن ندامت بیٹھا سُن رہا ہے۔ اچھے لوگ تھے اچھی گذار گئے۔

اپنی وضع کے پکّے۔ جس سے ایک دفعہ جس طرح مل لئے ساری عمر اسی طرح نباہ دی۔ وضع داریاں تھیں۔ دوستوں میں دوست داریاں۔ دشمنی بھی شرافت کے ساتھ۔ یہ آجکل کے چھوکرے نہ دوستی میں بھدرک نہ دشمنی کو قیام۔ آج یارانہ ہے۔ کل چخ گئی۔ آج دانت کاٹی روٹی کل خون کے پیاسے۔

شکلیں دیکھئے زرد رو امراض کا شکار۔ بیماریوں کی پوٹ۔ چھپٹی سے ہاتھ پیر۔ کبوتر سے سینہ۔

انھیں آنکھوں نے آج کل کے چھوکروں کو بھی دیکھا اور اگلے وقتوں کے مرے گرے بچے کھچے بوڑھوں کو بھی دیکھا تھا۔ ہمارے دادا کے پاس میر خادم علی آیا کرتے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے ایک دفع نہیں سَو دفعہ ناپی ہے۔ آٹھ انگل کی کلائی تھی یہ معلوم ہوتا تھا آدمی نہیں ہاتھی کا پاٹھا چلا آرہا ہے۔

اگلے لوگ معاملہ کے کھرے۔ موچھوں پر سودا کرتے۔ کیسی تحریر۔ کہاں کی نوشت۔ جو منھ سے کہدیا پتھر کی لکیر تھی۔ جان جائے آن نہ جائے۔

دوست تھے تو پکّے دوست۔ دشمن تھے تو ظاہر ظہور۔ آجکل منھ پر بھائی دل میں قصائی۔

بڑے میاں برس رہے تھے۔ اور لڑکے کی آنکھوں سے جھڑی لگی تھی۔ ہوا کے جھونکے آئے ورق پر ورق اُلٹے۔ مہریں ٹوٹیں۔ قفل کُھل گئے۔ سرنگوں نوجوان نے سر اُٹھایا اور کہا..... "ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں"

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ، باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ سچ ہے کہ ہم بیمار ہیں کہ ہم پا بہ جولاں ہیں حقیقت کہ ہمارے منھوں پر قفل، پھر قفلوں پر مہریں ثبت ہیں۔ لیکن یاد رکھئے۔ آپ کو خدا کے روبرو جانا ہے۔ حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے۔ سچ سے منھ نہ موڑئے۔ ایمان کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ اس سے انکار نہ کیجئے کہ ہم کو بیماری ورثہ میں ملی اور بڑوں نے خریدی تھی۔ ہم پا بجولاں ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پیش رفتگان کج رفتار تھے۔ ہم کو حکم زبان بندی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اجداد کلمۃ الحق سے منحرف ہوئے۔ دریدہ دہنی اختیار کی۔ ہم غلام ہیں۔ آزادہ منش بڑے بوڑھوں نے آزادی عیش و عشرت کی بھینٹ چڑھائی۔ ہم محکوم ہیں حاکموں نے حکومت تج دی۔

اُن کے گناہوں کا عذاب ہم بھگت رہے ہیں۔ ان کی خطاؤں کی مکافات ہم کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ بزم مے میں خم کے خم اُنھوں نے لنڈھائے۔ عالم رنگ و بو میں رنگ رلیاں اُنھوں نے

کہیں ۔ بلانوشوں نے دُردِ تہِ جام صبوحی کو بھی نہ چھوڑی ۔

حریفان بادہ ہا خوردند رفتند — تہی خمخانہا کردند رفتند

موردِ الزام ہم ہیں یا وہ ۔ خطاکار ہم ہیں یا وہ ۔ مسلمانوں تم ہی ایمان سے کہو خدا لگتی ۔ خزانہ لٹا گئے ۔ ہم کو بھکڑ بنا گئے ۔ اچھے لوگ تھے اچھی گذار گئے ۔ ہم پر بُرا وقت ڈال گئے ۔ تلوار کے بدلہ توہم پرستی ۔ رجز کی جگہ مثنوی عیش ونشاط ۔ جرأت کی جگہ بزدلی ۔ واقعاتِ رزم کے بدلے داستانِ بزم ورثہ میں دے گئے ۔ پھر بھی قابل پرستش وہ اور موردِ الزام ہم ۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — ناطاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

اچھا باپ دکان کا حساب بے باق کر کے اولاد کے حوالے کرتا ہے ۔ جائداد کی مرمت کرا کے بیٹے کو دیتا ہے ۔ خزانہ بھر کر کنجیاں وارث کو سونپتا ہے ۔ وہ دکان لٹا گئے ۔ جائداد ڈھا گئے ۔ خزانہ کی کنجیاں اغیار کے حوالے کر گئے ۔ ہم کو ایک بدنام شدہ نام اور غلامی کا طوق ورثہ میں دے مرے ۔ پھر بھی متمنی ہیں کہ ہم ان کی شان میں قصیدہ پڑھے جائیں اور ان کی زبان مبارک سے اپنی ہجو سن کر مرحبا اور صل علیٰ کہتے رہیں ۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم اب ایسے اندھے نہیں رہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اس ترکہ کی حقیقت کو جان لیا جو بزرگ چھوڑ مرے تھے ۔ یہ شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے ۔

زمانہ ہمارا اور ان کا آئینہ دار ہے ۔ اعمال کراماً کاتبین لکھ رہے ہیں اور صفحۂ تاریخ بھی عکاس ۔ افراد کے خلاف جرائم میدان حشر میں آشکار ہوں گے ۔ ملک وملت کے خلاف دنیا کے دنیا میں نظر آجاتے ہیں ۔ سزا وہاں دی جائے گی ۔ لعنت کے طوق یہاں پہنائے جاتے ہیں ۔ تاریخ کی سیاہی روشنائی کا کام دیتی ہے اور کہیں روسیاہ کر دیتی ہے ۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے اپنے اور ہمارے اعمال دیکھتے جائیے ۔ اور اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھتے جائیے ۔ یہ کہہ کر نوجوان نے ایک صفحہ الٹا ۔

شعر وسخن کا چرچا ہے ۔ بزم سخن آراستہ تعریف و توصیف کا غلغلہ فلکِ ہفتم کی خبر لا رہا ہے ۔ سمار سخن کے مہر و انجم جمع ہیں ۔ بلند پرواز آسمان کے تارے توڑ کر لا رہے ہیں ۔ اشعار کی بندش عقد پرویں پر چشمک زن ۔ نقادان سخن پر موتی نچھاور کر رہے ہیں ۔ روشن خیالوں کے سامنے شمعیں روشن ۔ بانکے ترچھے جوان بیٹھے ہیں ۔

سال خوردہ ثقہ صورت بھی تشریف فرما۔

اتنے میں ایک حسن و عشق کے قصہ خواں۔ گل و بلبل کے قصیدہ گو۔ گلرنگ بدن پر شبنم کا کرتہ پہنے دو پلڑی ٹوپی لگائے۔ بہار عشق دکھاتے اور زہر عشق پلاتے تشریف لائے۔ شوقین مزاجوں نے ہاتھوں چھاؤں لیا۔ یہ نواب مرنا شوق ہیں۔ حاضرین نے اظہارِ شوق کیا۔ اُنھوں نے شعر خوانی شروع کی۔

خدائے سخن نے بت توبہ شکن لا کھڑا کیا۔ حسن مرد افگن نے زاہد صد صالہ کو متوالا بنا دیا۔

شاعر نے حسن و شباب کا ساغر چھلکا دیا۔ جوان جھومنے لگے۔ عشق سر پر کھیلنے لگا۔ حسن بے پردہ درانہ سربام کھڑا تھا۔ جوش شباب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ کہ اتنے میں۔

جب نظر سے نظر دوچار ہوئی	ایک برچھی جگر کے پار ہوئی
رنگ رُخ دیکھتے ہی زرد ہوا	دل میں بے اختیار درد ہوا
منھ سے مشکل کشا کا نام لیا	یا علی کہہ کے دل کو تھام لیا

یار جھلک دکھلا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہاں دنیا آنکھوں میں اندھیر۔ حالِ عاشق تباہ ہونے لگا۔ ایک یار شاطر نے اپنی بساط مطابق کوشش کی۔ کسی نہ کسی چال سے اس لالہ رُخ تک جا ہی پہونچا اور کہا۔

قسمیں دے کر دعا پلاؤں انھیں	چل کے ذرا دیکھ آؤ انھیں
نام چلنے کا سن وہ عاشق کش	بولی تیوری چڑھا کے خیر ہے خوش
دل میں یہ کیا خیال آیا ہے	خاتگی کسبی کچھ بنایا ہے

آخر کار۔ بت کو لائے وہ التجا کر کے کفر توڑا خدا خدا کر کے

گل کو بلبل کے پہلو میں لا بٹھایا۔ سرو پہ قمری کا آشیانہ بنایا۔

ہٹ گئے سب زنانہ کروایا	باغ میں اُن کو لا اُتروایا
منھ دوپٹے سے ڈھانپتی اُتری	خوف کے مارے کانپتی اُتری
سب حیا سے بدن چرائے ہوئے	پائنچے ناز سے اُٹھائے ہوئے

اب پیاسا پانی کی طرف بڑھا۔ دست گستاخ اِدھر اُدھر پڑنے لگا۔ دل دار دل برداشتہ

ہو کر بولا۔

توبہ کس درجہ بے حیائی ہے — واہ کیا دیدے کی صفائی ہے
کیا کہوں اور بے حیا تجھ کو — پھٹے منہ لعنتِ خدا تجھ کو

غرض کہ۔

وہ کہاں کی بہت نہیں رہے نہیں — دل بیتاب مانتا تھا کہیں

دست عیش سازِ ہستی پر زمزمۂ دل کشا بجا رہا تھا۔ مطرب طرب زا وصل کے گیت سُنا رہا تھا۔ شاعر سبز باغ دکھا رہا تھا۔ بہارِ عشق کی سیر کرا رہا تھا کہ سحر البیان نے بیان کا رُخ بدلا۔ امرت کے بدلے زہر اُگلا۔ وصل مبدل بہ فراق ہوا۔ سازِ ہستی ٹوٹ گیا۔ شمع محفل بجھ گئی۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ زمرد خط حرف غلط ہو چکا تھا۔ شبِ فراق پھن اُٹھائے کھڑی تھی۔ زمانہ زہر اُگل رہا تھا۔

دوست کے پاس دوست کا سلام آیا ہے۔ دنیا سے جانے والے کا آخری پیام آیا ہے۔

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن باقی — نہ کسی جا ہے نلدمن باقی
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کُلُّ من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

سُننے والے سر دھن رہے تھے۔ ہر چہار طرف سے ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں بلند تھیں۔ سازِ ہستی سے بروگ رس ٹپک رہا تھا۔ آنکھوں سے دریا بہہ رہے تھے۔ دلوں میں طوفان بپا تھا۔

ابھی نرگس چشم نونہال حسن کی تربت پر اشک پاشی کر رہی تھی۔ زبان سوسن حسن خموش پر نالہ کناں زبان حال سے کہہ رہی تھی۔

گر پیر نود سالہ بمیرد عجبے نیست — ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

خارِ زہر آلود غنچہ کے دل میں چبھا تھا۔ بلبل زخم کرید رہا تھا۔ خاک کا سینہ چاک کر کے نکلنے والے گلِ خاک میں مل رہے تھے۔ لالۂ خونیں دہن سینہ میں سمِ سیاہ چھپائے کھڑا تھا۔ مارِ سنبل زہرِ عشق سے بیتاب پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کہ ایک پری چھم چھماچھم کرتی محفل میں آئیں۔ چاند سے کھڑے پر کتاں کا دوپٹہ۔ موتی سے بدن پر آبِ رواں کا کرتہ۔ شرمائے لجائے۔ بدن چرائے سو سو بل کھاتی آئیں۔ اہلِ محفل کی جان میں جان آئی۔ جان صاحب تشریف لائے۔

ہاتھوں میں مہندی پور پور چھلے۔ آنکھوں میں سرمہ۔ افشاں چنی۔ ہونٹوں پہ لاکھا دانتوں پہ مسّی۔ توبہ شکن۔ بدن سمیٹے محفل میں بیٹھے۔ للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔ درخواستیں گذرنے لگیں۔ قدر دانوں کے اصرار پر بہت انکار کے بعد بصد ناز مرزا سودا کی جانب رخ کر کے فرمایا۔

جان تک مجھ سے نہیں رکھتے ہو پیاری مرزا   کس طرح بھولے مجھے یاد تمھاری مرزا
مجھ زلیخا کو خدا نے دیا تجھ سا یوسف   شکر ہے تجھ میں سو جان سے واری مرزا
ساس نندوں کی محبت کے میں قربان گئی   جاؤں میکے مجھے منگوا دو سواری مرزا
کروٹیں بدلیاں پر نیند نہ تم بن آئی   کس مصیبت میں کٹی رات ہماری مرزا

شعر پڑھ کاغذ ماما کے حوالہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بولیں چل ری نرگس یہ موئے مردوئے بدنگاہی کرتے ہیں۔

یہ اتنا کہہ چھب دکھا چلتے ہوئے۔ دل جلے دل تھام کر رہ گئے۔ ایک سمت سے آواز آئی۔

کبھی کوچہ میں حسینوں کے گذارا نہ کرے   دل کو مارے قدم اس راہ میں مارا نہ کرے
خوش نگاہوں سے محبت کا اشارا نہ کرے   جان دے شربتِ دیدار گوارا نہ کرے
آنکھ گر ابرو و مژگانِ ستمگر پہ جائے   تیغ سے کاٹے گلا مار کے چھریاں مر جائے

شاعر طبع شناس نے فرقت زدوں کو شربتِ وصل پلایا۔ امانت نے سرِ محفل امانتِ حسن دھڑی دھڑی لٹا دی۔ سرشار کر دیا۔ بن پلائے بے خودِ گفتار کر دیا۔ کہا۔

جب لگا نیند سے انگڑائیاں لینے وہ گل   چمنِ بزم سے سب اڑ گئے مثلِ بلبل
پھر تو خلوت میں لگا چلنے بہم ساغر و مل   نشۂ مے سے وہ بیہوش ہوا جب بالکل
دستِ گستاخ بصد شوق بڑھایا میں نے   گھات سے داؤں پہ اس گل کو چڑھایا میں نے

اہل محفل پر تعیش کا بھوت سوار تھا۔ آنکھیں چڑھتی تھیں۔ دل میں خمار تھا۔ برناؤ پیر جھوم رہے تھے عیش و نشاط کی دیوی کے قدم چوم رہے تھے۔ ساقی نے مینائے سخن لنڈھا دی تھی۔ جذبات میں آگ لگا دی تھی ظالم گھر پھونک تماشہ دیکھ رہا تھا۔ دو گھڑی کی واہ واہ نے اُسے اندھا کر رکھا تھا۔ اور وہ دنیا کو اندھا کر رہا تھا۔

جو قوت قدرت نے سوتوں کو جگانے کے لئے ودیعت کی تھی۔ اس سے جاگتوں کو سلا رہا تھا۔

آسمانِ سخن کے آفتاب حضرت داغ کے سامنے شمع آئی۔

بھاری بھرکم فربہ اندام۔ سیاہ رنگ ستیلا منھ داغ۔ تیز تیز آنکھیں۔ طباق سا چہرہ۔ تن زیب کا کرتہ زیب تن کئے۔ لوہارو والوں کی چوگوشیہ۔ ٹوپی سر پر رکھے بڑی سج دھج سے بیٹھے تھے۔ صدر محفل کا اشارہ پا نہایت پاٹدار آواز میں غزل نذر سامعین فرمائی۔

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

دلوں پر سینکڑوں سکّے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں
کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں

الٰہی کیوں نہیں اُٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

یہ گستاخی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے اے دلِ ناداں
ابھی وہ روٹھ جائیں گے ابھی وہ من کے بیٹھے ہیں

شبک ہو جائیں گے گر جائیں گے وہ بزم دشمن میں
کہ جب تک گھر میں بیٹھے ہیں وہ لاکھوں من کے بیٹھے ہیں

فسوں ہے یا دعا ہے یہ معمّا کھل نہیں سکتا
وہ کچھ پڑھتے ہوئے آگے مرے مدفن کے بیٹھے ہیں

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

نگاہ شوق و چشم شوق میں در پردہ چھنتی ہے
کہ وہ چلمن میں ہیں نزدیک ہم چلمن کے بیٹھے ہیں

یہ اُٹھنا بیٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائے گا
قیامت بن کے اُٹھیں گے بھبوکا بن کے بیٹھے ہیں

کسی کی شامت آئی ہے کسی کی جان جائے گی
کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

قسم دے کر انھیں سے پوچھ لو تم رنگ ڈھنگ اس کا
تمھاری بزم میں کچھ دوست بھی دشمن کے بیٹھے ہیں

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

کالی گھٹا نے مے برسا دی۔ ساقیٔ سخن ساز نے سرمستوں کو سیاہ مست بنایا۔ بلبل رنگیں بیاں نے اہل محفل کو رنگ تعیش میں رنگ دیا۔

آزمودہ کار و نو گرفتار سب کو حسن بازاری کا مشتری بنا دیا۔ زہرہ جبینوں کا اکھاڑا جما دیا۔

مریخ فلک سپاہ توبہ شکن بے آیا۔ دبیر فلک نے فلک انجم پہ انجم سے لفظ عشق لکھا۔ ہر ہر کشش کشش عشق بن گئی دائرے زلف پر شکن کی شکن۔ زیر و زبر نے میزان دل زیر و زبر کر دی۔ زمانہ عشق کا دیوانہ ہو گیا۔

محفل پر یہ کیفیت کیف طاری تھی کہ میر حسن آئینہ دار حسن کھڑے ہوئے۔ شاعر بے نظیر نے ماہتاب کے روبرو بدر منیر کھڑا کیا۔

قصہ زلف دوتا چھیڑ دیا۔ کالی گھٹا چھا گئی۔ کالوں میں لہر آ گئی۔

شاعر موشگاف نے یوں ارشاد کیا۔

پلا ساقیا ساغر مشک بو — کہ ہے مجھ کو در پیش تعریف مو
سر شام سے دے یہاں تک شراب — کہ مستی میں دیکھوں رخ آفتاب
کروں اس کے بالوں کا کیا میں بیاں — نہ دیکھا کسی رات میں یہ سماں
کہوں اسکی چوٹی کا کیا رنگ ڈھنگ — کہ جو آخری شب ہو جھمکیگا رنگ
نمایاں تھی یوں اوڑھنی سے جھلک — کہ جوں ابر میں برق کی ہو چمک
موباف زری نے کیا ہے غضب — دیا ہے گرہ ان کو دنبال شب
الٹ کر نہ دیکھے اُسے ہوشیار — کہ وہ اک ستارہ ہے دنبالہ دار

کہاں تک کہوں اس کی چوٹی کی بات
کہ تھوڑا ہے سانگ اور بڑی ہے یہ رات

یہ زلف گرہ گیر۔ بغیر دل گیر کیسے رہتی۔ یہ مار سیاہ بغیر من کیوں کر جیتا۔ یہ چاند بغیر چکور یہ گل بغیر بلبل یہ سرد محروم قمری۔ یہ مست شباب بغیر دست مشتاق نہ رہنا تھا نہ رہا۔

بے نظیر چندن چکور بنا۔ قرآن السعدین ہوا۔ بدر منیر اور بے نظیر برج وصل میں جمع۔

غرض ہو کے آپس میں راز و نیاز — پئے دو پیالہ بصد امتیاز
پھر آخر کو شہزادہ نے بھی اٹھا — دیا ساغر اس مہ کے منہ سے لگا
لگی ہونے بے پردہ پھر چھیڑ چھاڑ — در حسن کے کھل گئے دو کواڑ
لگے پینے باہم شراب وصال — ہوئے نخل امید سے وہ نہال

لبوں سے ملے لب دہن سے دہن
دلوں سے ملے دل دہن سے دہن
لگی آنکھ سے آنکھ خوش حال ہو
گئیں حسرتیں دل کی پامال ہو
اُٹھے پیکے باہم شراب امید
کوئی سرخ رو اور کوئی رو سفید
نشہ سے وہ لذت کے بیہوش ہو
گئے بیٹھ مُسند پہ خاموش ہو
عرق میں اُدھر غرق وہ مہ جبیں
گئی آنکھ نیچی اِدھر نازنیں
یہ بیٹھے تھے خوش ہو کے باہم ادھر
کہ اتنے میں باجا ادھر سے پہر

صبح ہوگئی۔ نسیم سحر برائے صبوحی گلزار نسیم لائی۔ آنکھ اُٹھائی تو تسنیم لکھنوی مینا بدست سر محفل کھڑے تھے۔ مخمور آنکھیں۔ صراحی سی گردن۔ رنگ گلابی تھا رخسار میں۔ بلکہ مست کاکل سرمست پر۔ شمع جھومتی آگے بڑھی۔ اس جوان نے۔ شرابِ شباب لنڈھادی۔
شاعر فسوں ساز نے اندر کا اکھاڑہ جمایا۔ ایک ایسا گل کھلایا کہ چشمِ کور کو بینا بنایا۔ پری نژاد کو آدم زاد کے پہلو میں لا بٹھایا۔

پیارا تھا بنے بنی کا جوڑا
خلوت میں دولہا دلہن کو چھوڑا
سیاں کہ ہزارہا بھری تھیں
ارمان سی سب وہاں سے نکلیں
بے پردگی ہوتی تھی جواں میں
دروازوں نے بند کرلیں آنکھیں
طومار حجاب کو کیا طے
ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے
مستانہ ملا دلہن سے نوشاہ
صحبت ہوئی دختِ رز سے دلخواہ
مست آنکھیں تھیں رشکِ جام سرشار
لبریز ہوئی شراب دیدار
ثابت وہ جو شب کو تھے ستارے
خورشید نکلتے ہی سدھارے
یعنی دولہا دولہن سحر گاہ
نکلے آرام گاہ سے دل خواہ

تاجدار مشرق خونی پرچم لئے سیاہ رو کو کاٹتا سر پر چڑھا آرہا تھا۔ محفل اُجڑ رہی تھی نشے گھٹے تھے۔ شمع محفل اپنے آنسوؤں میں غرق، خاک سے جا ملی تھی۔ اہل محفل کے سرپائے ساقی پر

اور دماغ عرش پر تھے۔ میلا بچھڑنے کو تھا اور سیلانی بے خبر۔ دن نکل آیا تھا اور یہ پڑے سو رہے تھے۔ اس میکدۂ مشرق میں نسیم سحر بھی سامانِ صبوحی لائی تھی۔ بجائے جگانے کے سلاتی ہوئی آئی تھی۔ اے وائے بختِ خوابیدہ۔

محفل پر یہ رنگ طاری تھا کہ ایک جانب سے آواز آئی

سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

صفحۂ سفید کی طرف نگاہ پڑی تو چند برناؤ پیر جمع ہیں۔ مولانا حالی نے ابھی مسدس حالی ختم کی ہے۔ سب دست بدعا ہیں۔ سیپی سے چہروں پر موتی سے آنسو گر رہے ہیں۔ مولانا خشوع وخضوع کے ساتھ عرض حال کر رہے ہیں۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے
گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے
جو کچھ ہیں وہ خواہ اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت شکوہ ہے زمانہ کا نہ قسمت کا گلہ ہے
فریاد ہے اے کشتئ امت کے نگہباں بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
کل دیکھئے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

اب دن چڑھ آیا تھا۔ انجمن میں ہر چہار طرف ایک نئی روشنی سی پیدا ہو گئی تھی۔ شب پرک سرشت اس ضیاء سے خیرہ ہو گئے۔ صراطِ مستقیم سے بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے لگے۔ فلسفۂ مغرب کے سامنے مشرقی مذہبیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ نئے تخیلات نوخیز طبائع پر طاری ہو گئے۔ حاکم کا رنگ چڑھنے لگا۔ محکوم اپنے رنگ ڈھنگ بدلنے لگا۔

اب اکبر الہ آبادی کھڑے ہوئے مزاحیہ انداز میں متنبہ کیا۔ فرمایا۔

ہمنشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا — میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا
نیشنل فیلنگ تو ہم سب میں کبھی تھی ہی نہیں — اتحادِ دین فقط باقی رہا تھا اب گیا
ہے عقیدوں کا اثر اخلاقِ انساں پر ضرور — اس جگہ کیا چیز ہوگی وہ اثر گر دب گیا
پیٹ میں کھانا زباں پر کچھ مسائل ناتمام — قوم کے معنی گئے اور روح کا مطلب گیا
منقلب ہوتے ہیں ہم طالب علموں کے کورس — کورس بھی رخصت ہوا اس کا زمانہ جب گیا
اتحادِ معنوی ان میں برائے نام ہے — دیکھتے ہو اک گروہ اک راہ ہو کر کب گیا
مجلسِ دنیا میں کس صف کے بنو گے مستحق — دور ہو اور لورڈ سے ادبر تو یارب گیا

ہم یہی کہتے ہیں صاحب سوچ لو انجام کار
دوسرا پھر کیا ٹھکانا ہے اگر مذہب گیا

فلسفیانِ مغرب نے دماغوں پر قابو پایا۔ بعتانِ مغرب نے دلوں پر سکہ جمایا۔ نونہالانِ مشرق بوستانِ مغرب سے گلہائے علم چننے گئے۔ گلرخوں کے ہو رہے۔ عروسِ علم لینے گئے تھے۔ غولِ حسن کے گرفتار ہوئے۔

گوری گوری چلتی پھرتی چینی کی گڑیاں دیکھیں شیشۂ دل چور ہو گیا۔ بھارت ورش کے سپوت حقِ نمک بھول گئے۔ حسنِ ملیح سے منہ موڑ لیا۔ حسنِ صبیح سے ناتا جوڑ لیا۔ شمع کے پروانہ بجلی کے دیوانہ ہو گئے۔ یہاں لو سے لو لگاتے تھے۔ وہاں شیشہ کی کپی سے ٹکرا ٹکرا کر جان دینے لگے۔

قوم کی یہ حالت دیکھ کر اکبر الہ آبادی پھر کھڑا ہوا اور کہا۔

اک لعبتِ چین کو لنڈن سے جو بیاہ کے لائے مفاعلین
احباب نے تیرِ مطاعن سے اُن کے دل کو مجروح کیا

باپ اُن کے یہ بولے کشتی مری واللہ ڈبو دی ہائے غضب
اس لڑکے نے صحبتِ بد پا کر یہ کار ابنِ نوح کیا
تعلیم کو میں نے بھیجا تھا تزویج کی اس نے ٹھہرائی
ممدوح تو بیٹا بھول گیا بس اپنے تئیں منکوح کیا
لڑکے نے جواب میں عرض کیا اے قبلہ و کعبہ سُنیئے تو
یہ کون برائی میں نے کی جو فاتح کو مفتوح کیا

حکومت اربابِ سیاست نے لے لی۔ عزت مجسٹریٹوں کے ہتھے چڑھی خودداری محکمہ فوجداری کے حوالہ ہوئی۔ اب لے دے کے اک خدا کا آسرا رہ گیا تھا۔ اس پر بھی بتانِ فرنگ کو چھاپا مارتے دیکھ کر اکبر کہہ اٹھا۔

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں جو دوچار
ہائے وہ حسن و شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلفِ پیچاں میں وہ بج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعناں میں وہ خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار.......کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ فلک پیار کریں
گرم تقریر جسے سُننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سُن کر جسے بلبل جھپکے
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حسن بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یاحفیظؑ کا کیا وِرد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایمان ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
نازو انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی!!

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر!
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں!
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی!!

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح ❊ اب زمانہ میں نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق ورف رف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی یہ پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحث بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کی گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ و یہ وہم

میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو!
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

جگانے والا شفقت اور پیار سے جگا رہا تھا مگر یہ نیند کے ماتے چیتنے والے نہ تھے سمجھانے والا ہنس کر چمکار کر سمجھا رہا تھا۔ پر یہ خیرہ سر سمجھنے والے نہ تھے جب یہ بھوت باتوں سے نہ مانا تو زمانے نے ٹھوکریں لگائیں۔

اب اقبال قوم اقبال نے سنبھالا۔ اہل محفل کو مخاطب کر کے للکارا۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

ہیں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

اب نوجوان نے پیر مرد کی جانب دیکھا اور کہا۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا۔

بڑے میاں دل میں تو بہت لئے گئے پر اظہار ندامت سے گریز پا معلوم ہوتے تھے۔ سکوت اعتراف جرم کے مترادف اور کچھ کہنے کو منہ نہ پڑتا تھا۔ آنکھوں میں تجسس تھا۔ دماغ میں کاوش لیکن بات کچھ ایسی بگڑی تھی کہ بنائے نہ بنتی تھی۔ تاہم یہ سال خوردہ و باراں دیدہ اس دور کی پیداوار تھے جبکہ تاویل حسن بیان اور دروغ گوئی معراج کلام تھی۔ حقیقت پہ پردہ ڈالنا فن لطیف تصور کیا جاتا اور سخن سازی کمال سخن۔

یہ بزرگوار ٹھنڈے پیٹوں آسانی سے قابو میں آنے والے تھے نہیں دل میں چور تھا آنکھ نہ ملا سکے نوجوان پر دزدیدہ نگاہی اور کہا۔

پڑھے لکھے ہزار ہو بابا
ابھی ناکردہ کار ہو بابا

میاں صاحبزادہ ادب کو اخلاقی معیار میں تولنا باد را بگز پیمودن ہے۔ نقد سخن کی میزان اور ہوتی ہے۔

ادب میں اخلاقیات کی آمیزش شراب میں نمک گھولنا ہے۔ تم بچے ہو

دیوانہ ہوئے ہو۔ جواہرات کے صندوقچہ میں گندم تلاش کرتے ہو۔ مشک کی ڈبیا میں ہینگ کے طلبگار ہو۔ ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد۔ عقل سے کام لو سماع واعظ کجا نغمۂ رباب کجا۔ تم کہاں آ گئے ہو اور کیا تلاش کر رہے ہو؟ درِ خرابات مپرسید کہ ہشیار کجاست۔ یہ بزم ادب ہے۔ محفل وعظ نہیں۔ یہاں ذکرِ حور و قصور نہیں۔ قصور معاف یہاں حور و قصور ہیں۔ یہاں سلسبیل لبِ گل رنگ اہل بزم کو سرخ رو کرتی ہے۔ یہاں وعدہ سلسبیل نہیں۔ اس محفل میں در دنداں شیرازۂ حیات منقطع کرتے ہیں۔ احتیاط سے رکھے ہوئے موتیوں کے بیان نہیں ہوتے۔ یہاں شباب میخانہ بدوش پھرتا ہے۔ حورِ سال خوردہ واعظ کرم خوردہ کو مبارک۔

یہ خمخانۂ شعر و سخن ہے۔ خمکدۂ کلام و بیان۔

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

اس عالم میں قادر البیان پیرِ فلک کا سینہ چاک کر خونِ شفق نکالتے ہیں۔ کہکشاں سے جوئے شیر لاتے ہیں۔ بلند پرواز آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ زہرہ اور مشتری کو زینت محلِ رندانہ بناتے ہیں۔

یہاں سحر البیان شمع کی مانند روتے ہیں رلاتے ہیں۔ پروانہ کی طرح جلتے ہیں جلاتے ہیں۔ سینہ فگارانِ چمن کی مانند زخمِ دل دکھاتے سینہ کو چمن بناتے ہنساتے گذر جاتے ہیں۔

یہ محفل شعر و سخن ہے۔ یہاں وعظ و نصیحت پند و تلقین کی گنجائش نہیں۔ دَیر میں خداپرست کی تلاش اور کعبہ میں کافر ڈھونڈنا سعی لاحاصل ہے اور تلاش ناپیدا فکرِ معقول بفرما۔

نوجوان نے بڑے میاں کی طرف متبسّم نگاہ ڈالی اور کہا۔ گستاخی معاف اگر جناب کے صاحبزادہ شراب لائیں اور فرمائیں اس کے رنگ و بو کی طرف توجہ فرمائیے۔ اس کی بوتل کو دیکھئے۔ اس فن پر غور کیجئے جس نے پانی میں آگ بندکی ہے اور اگر جناب کے فرزندِ ارجمند ایک بازاری عورت لے آئیں اور فرمائیں کہ اس کو نسائی حسن کے معیار سے

جانچئے۔ اس کے بدن کو دیکھئے۔ ہر ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہے۔ آواز کا ترنم۔ نگاہوں کی شوخی۔ اداؤں کی بے ساختگی دیکھئے اور اگر جناب کے خاندان کے چشم وچراغ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ساری جمع پونجی کے بدلہ کوئی بہترین مرقع خرید فرمالیں اور فرمائیں کہ اس کی رنگ آمیزی کو دیکھئے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ پر غور فرمائیے۔ معلوم ہوتا ہے منہ سے بولنے کو ہے۔ کاغذ سے باہر قدم رکھنے کو ہے۔ ان ماہر فن انگلیوں کا خیال کیجئے۔ جنھوں نے بے جان رنگوں میں جان ڈال دی۔ ایک کاغذ کے پرزہ میں روح پھونک دی۔

تو سینہ پہ ہاتھ رکھ کر ایمان سے فرمائیے کہ جناب والا کے اس وقت کیا جذبات ہونگے کیا آپ بیٹے کی ان حرکات کو مناسب تصور کریں گے۔ کیا جناب صاحبزادہ کی ہاں میں ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ کیا حضور اپنے چشم وچراغ کی چرب زبانی پر آمنا وصدقنا فرمائیں گے یا سر پکڑ کر بیٹھیں گے اور اپنی بپتا آنے والوں کو سنائیں گے۔ تاکہ ان کے کان ہوں اور اپنی اولاد کی احتیاط کریں

پھر ذرا یہ تصور فرمائیے کہ صاحبزادہ کی ان غلط کاریوں کا اثر آپ کے پوتوں اور پڑپوتوں نے قبول کیا۔ آپ کی نسل ہمیشہ ہمیشہ کو برباد ہوگئی۔ جن سے آپ کو آسرا تھا۔ وہ نونہال اجڑ گئے۔ آپ کے گلبن امید پہ باد خزاں چل گئی۔ آپ کے نام لیوا اور پانی دیوا شرابی ہوگئے۔ بوالہوس ہوگئے۔ مرقع پرست ہوگئے۔ اب فرمائیے کہ اس بربادی کو دیکھتے ہوئے آپ کیا کہیں گے۔ آپ اس لڑکے پہ ناز کریں گے یا اس دن پر افسوس جب وہ ناشدنی پیدا ہوا تھا۔

یہ ایک خاندان کا برباد ہونا تھا۔ ایک چھوٹے سے گھرانے کی تباہی تھی جس کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تصور کیجئے اس قوم کا جس پہ یہ بپتا پڑی ہو۔ خیال کیجئے ان بدنصیب آنے والی نسلوں کا جو بڑوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے دنیا کے میلہ میں پابجولاں لائی گئی ہوں۔

آپ کا لڑکا خاندانی گھر فروخت کر دیتا ہے اور پھر آپ کا پوتا اس ہی گھر میں

غلاموں کی طرح کام کرتا ہے۔ جہاں اس کے بزرگ رہتے بستے اور نوکروں پر حکم چلاتے تھے۔ خیال کیجئے، اس بدنصیب پوتے کے جذبات کا جب کہ اس کو اس مدوجزر کا احساس ہوگیا ہو۔

اب کہئے کیسی لگی۔ اس تصور سے آنکھیں کیوں ڈبڈبا آئیں۔ اس خیال سے دل میں ایک ہوک سی کیوں اٹھی۔ یہ اپنے گھر کا ذکر تھا...... ہم میں اور آپ میں صرف فرق اتنا ہے کہ آپ قوم کے گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتے تھے اور ہم اس راز کو جانتے ہیں کہ جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت آپ کو قوم پرستی اور جماعت کا تخیل چھو نہیں گیا تھا۔ اور ہم کچھ کھو کر سیکھے ہیں۔ آپ اس وقت پیدا ہوئے تھے جب کہ دنیا آپ کے قدموں میں تھی اور ہم نے اس وقت آنکھ کھولی جب زمانہ ہم سے آنکھیں پھیر چکا تھا روزگار برسرپیکار تھا۔ ہم کو ایک دوسرے کا سہارا درکار تھا۔ باد مخالف چل رہی تھی۔ ساحل دور تھا اور کشتی ڈوبنے کو مصیبت مصیبت زدوں میں اکثر پیدا کر دیتی ہے۔ ہم سب ایک کشتی میں تھے۔ اس کا ڈوبنا ہم سب کا غرق آب ہونا تھا۔ ہم میں متفقہ نقصان اور فائدہ کا احساس پیدا ہوا اور ساتھ کے ساتھ یک جہتی۔

آپ عیش و عشرت میں پیدا ہوئے۔ آرام و راحت میں پلے پروان چڑھے حکومت آپ کے ہاتھ میں تھی۔ دولت آپ کے قدموں میں مصیبت سے بے گانہ۔ تلخ کامی سے ناآشنا۔ لاڈلی اولاد تھے۔ نازنازبیا کے عادی۔ بڑوں کا ترکہ دھڑی دھڑی لٹا رہے تھے۔ مزے اڑا رہے تھے۔ شراب عیش میں مست آنکھیں بند کئے تباہی کے گڑھے کی طرف غزل خواں چلے جا رہے تھے۔

اور ہم اس وقت پیدا ہوئے جب کہ جناب کی عیش پرستیوں کی بدولت گھر میں سوائے رنج و آلام کے اور کچھ نہ بچا تھا۔

اگر غور سے دیکھیے تو کسی زمانہ کے ادبا اور شعرا کو مطعون کرنا بھی حق بجانب نہیں ہر دور کا ادب اس زمانہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی جس جگہ رہتی ہے۔

وہیں کے گرد و نواح سے شہد اخذ کرتی ہے۔ دریا جن گھاٹیوں۔ پہاڑیوں اور وادیوں میں سے ہو کر آتا ہے وہاں کے سنگ ریزے رنگ اور نشانات ساتھ لاتا ہے۔ یہی کیفیت ایک ادیب کی ہے۔ جس ماحول میں پیدا ہوتا اور زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کے اثرات قبول کرتا اور اپنے ہر ایک لفظ میں اس دور کی معاشرت طبیعت اور ذہنیت کی مکمل تصویریں چھوڑ جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب اردو ادب پیدا ہوا تو ہماری اخلاقی معاشرتی اور سیاسی حالت کیا تھی۔ ہمارے شاعروں کا گرد و پیش کیا تھا اور ہمارے سماج کی کیا کیفیت تھی۔

بعض کا خیال ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا زوال شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ بہادر شاہ شاہِ اورنگ زیب کا سال خوردہ ہمت شکستہ لڑکا زیبِ اورنگ ہوا۔ شاید یہ سلسلۂ تیموری کا بہادرِ ثانی ہوتا لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ تو بت پنج روزہ گذار پنج سالہ حکومت کے بعد جہانِ گذران سے گذر گیا۔

اب نام کا جہاں دار شاہ مالکِ تخت و تاج ہوا جہاں گیری تو درکنار نام کی لاج بھی نہ رکھ سکا۔ ایک سال کے اندر قتل کیا گیا اور جہاں دار دارِ بقا کو سدھارا۔

اس کے بعد فرخ سیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ چھ سال بعد قتل کیا گیا۔ اسی ایک سال کے دو اور وارث تخت نشین ہوئے اور تہ خاک پہنچا دیئے گئے۔

اب دور محمد شاہی شروع ہوتا ہے آج رنگ ہے۔ رنگیلے پیا زیب اورنگ یہ رنگ ڈھنگ حکومت کے نہیں۔ تانت باجی راگ پایا۔ نادر شاہ دُرّانی عذاب ناگہانی کی طرح آیا۔ دلی میں قتل عام ہوا۔ نظام الملک پیر نود سالہ خوردہ سال چھوکرے کی طرح آنسو بہاتا نادر شاہ کے روبرو آیا اور دست بستہ عرض کی۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اس کے بعد آنے والے شاہان شطرنج کی حکومت۔ حکومتِ شاہ عالم از دہلی تا پالم سے بیش نہ رہی جس کا اختتام ۱۸۵۷ء میں ہو گیا۔

اس دور میں راجا پرجا۔ شاہ رعایا۔ سب رنگِ تعیش میں رنگے تھے۔ امرا شیر قالین

تھے۔ شعرا ان شیروں کے مدح سرا۔ وزیر ہے چنیں شہریار چناں۔

افسران فوج خیر سے پالکیوں میں چڑھ کر رن سر کرنے جاتے تھے۔

امرا تخت و تاج کے دشمن۔ جذبۂ وفا شعاری مفقود ہو چکا تھا۔ غداری اور ریاکاری کی گرم بازاری تھی۔ ظاہری منہ دیکھے کی محبت رہ گئی تھی۔ صداقت رخت سفر باندھ چکی تھی۔ تصنع اور بناوٹ کا دور دورہ تھا۔ شاعری بھی اسی رنگ کی آئینہ دار حقیقت سے دور تصنع سے معمور۔

یہ کیفیت تھی سیاست اور حکومت کی مذہب نے بھی اس سرزمین میں نئے گل کھلائے۔ روح اسلام ختم ہو چکی تھی۔ جسد اسلام رہ گیا تھا۔ جذبہ مسلمانی مفقود۔ شیوع مسلمانی موجود اور اس نے بھی کچھ ایسا روپ بدلا تھا کہ پہچاننا مشکل ہوتا جاتا تھا۔ حقیقت تصنع سے بدل رہی تھی۔ صفائی رنگ آمیزی سے۔ عرب کا استوار کھجور کا درخت اس سرزمین کے اثر سے گلاب کی خاردار جھاڑی بنتا جاتا تھا۔

رسم و رواج اصل مذہب پر چھا گئے تھے۔ لباس نے جسم کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ فلسفۂ یوگ کی جنم بھوم میں تصوف کی بیل پھولی پھلی پروان چڑھی۔ اسلام جیسا سیدھا سادھا مذہب گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔

یہ رنگ عالم گیر تھا۔ جب مذہب اس کے چھینٹوں سے نہ بچ سکا تو ادب کیا۔ دامن بچا کر جا سکتا تھا۔

وہ سیاست تھی یہ مذہب اب معاشرت اور معیشت کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ خیال کن ز گلستان من بہار مرا۔

ہمارے شعرا کے دل و دماغ پر غلامی کے خول چڑھے تھے۔ پیٹ بُری بلا ہے۔ یہ امیر غریب، عالم جاہل سب کے ساتھ لگا ہے۔ اس دوزخ کو بھرنا ہی پڑتا ہے۔ اس دور کے شعرا کسی نہ کسی صاحب ثروت کے دست نگر ہوتے اور اپنے ممدوح کی بذل و عطا پر گذر کرتے آقا کی مرضی کے مطابق اپنی طبیعت کے خلاف پابندیوں کے تحت شعر کہتے تھے۔

دولت دنیائے دوں سفلہ پرور جاہل نواز ہے۔ اکثر امرا اسی زمرہ میں سے تھے اور شعرا کو ان کی لے پر الاپنا پڑتا۔ کسی آدمی سے آپ ایک خاص عرصہ میں خواہ باغ لگوالیں خواہ جھاڑو دلوادیں۔ یہی کیفیت دماغی کام کی ہے۔ ایک ادیب سے ایک فرصت میں خواہ بے معنی زٹل قافیہ کہلوالیں۔ خواہ پر مغز بامعنی درہائے معنی حاصل کرلیں۔

اس حقیقت کی بہترین مثال ہم کو انشاء اللہ خاں انشا میں ملتی ہے۔ نواب نے ایک مصرع کہہ دیا ان کو غزل پوری کرنی پڑی۔ ملاحظہ ہو۔

پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیسی کی ٹوپی۔ یاں وقت سلام اترے ہے۔ ابلیس کی ٹوپی

ممدوح ان داتا کو غصہ آگیا۔ مرد میدانِ سخن کو اوڑھنی اوڑھنی پڑی۔ انشاء اللہ خاں لحیم شحیم ست نفٹے مردِ معقول ناک پر انگلی دھرے فرمارہے ہیں۔

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ　　　بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

تخت نشین ممدوح۔ لونڈی بچہ کمینہ خصال چھپر کھٹ پر بیٹھا پھولوں کا گجرا اچھال رہا ہے اور انشاء اللہ خاں کھڑے فرمارہے ہیں۔

لگا چھپر کھٹ میں چارپے اچھالا تو نے جو لیکے گجرا

تو موجِ دریائے چاندنی میں وہ ایسا جاتا ہی جیسے بجرا

یہی انشاء اللہ خاں جب معتوب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی　　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں　　　نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

پہلے دور میں دولت انشاء کے قدموں میں تھی لیکن اقلیم سخن ہاتھ سے نکلی جارہی تھی۔ دوسرے دور میں یہ شیر نیستان سخن خاک نشین تھا لیکن طائر سدرہ نشیں اس کا شکار۔ یہ شاہ سخن راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا نقدِ سخن لٹا رہا تھا۔ آنے والی نسلوں کے لئے جواہر ریزہ چھوڑ کر جارہا تھا۔

سچ یہ ہے کہ اس عہد میں سیمرغ خاکروبوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ان سے کوڑا سمٹوایا جارہا تھا۔

قصیدہ گوئی کا زور تھا شاعروں نے گداگری اختیار کرلی۔ کلام فقیر کی صدا بن گیا اور

اور شاعر کی بیاض کشکول گدائی۔ جو شمع بزم جہاں منور کرنے پیدا کی گئی تھی۔ اس سے تنور شکم گرم کیا جانے لگا۔ جس طاقت کا کام سوتوں کو جگانا تھا وہ خود گلیم گدائی اوڑھ کر سو گئی۔ جو ہما ظل شاہی تھا۔ شہباز آز کا شکار رہا۔

اندھیر تھا شمع ادب پر فانوس شکم ڈھکا تھا۔ غذائے روح نان شبینہ کیلئے دریوزہ گر قصیدہ نان جویں کے لئے کہا جاتا اور غزل خراج تحسین کے لئے۔ غزل کی خصوصیت ہے کہ ایک شعر دوسرے شعر سے معنی میں مختلف ہوتا ہے۔ تصوف معاملہ بندی۔ رندانہ روی۔ وصل و فراق۔ ادا بندی۔ اخلاقیات غرضکہ ہر قسم کے تخیلات کا ایک بے جوڑ مجموعہ پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے خیالات میں تسلسل کا نہ ہونا کلام کو اثر سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ چندے لطف محفل رہتا ہے اور بس۔

معنی میں اس درجہ آزادی لیکن بحر ردیف اور قافیہ کی سخت پابندی لازم حقیقت یہ ہے کہ ہم حقیقت اور معنی سے دوچار پڑے تھے۔ لیکن فروعات اور ظاہری پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ رنگ ہمہ گیر تھا۔ صرف شاعری سے مخصوص نہیں۔

یہ سمجھنا کہ ہندوستان میں امن و عافیت کی کمی ہمارے ادب کو پستی کی طرف لے جارہی تھی حقیقت پر پردہ ڈالنا ہوگا۔ جبکہ عرب زمانہ جاہلیت کا ادب تیار کر رہا تھا حنظلہ وفا اور خودداری کا پیغام پہنچا رہا تھا۔ عنترہ جرأت اور بہادری کا سبق دے رہا تھا۔ اسوقت صحرائے عرب میں امن و امان نام کو نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ پُرخطر زندگی اندیشہ ناک معیشت جوہر انسانی سطح پر لاتی ہے اور متمدن و مامون زندگی۔ فراوانی عیش و نشاط کا باعث ہوتی اور خیالات کو ابتذال کیطرف لے جاتی ہے۔ برخلاف اس کے خطرہ اندیشہ اور مصائب انسانی ہمدردی اخوت اور یگانگت کے جذبہ کو ابھارتے اکساتے اور منظر عام پر لاتے ہیں۔

داغ کی رندانہ روی۔ عاشقانہ گوئی اور رنگ تغزل ملاحظہ ہو اور ساتھ کے ساتھ اسی شاعر کا شہر آشوب دیکھئے۔ زمین آسمان کا فرق ہے ایک طرف درد اور ہمدردی کی تصویر نظر آرہی ہے دوسری طرف پستی اپنا رنگ جما رہی ہے۔ وہی شاعر ہے وہی داغ۔ ایک طرف محفل عیش سے مینا بدوش نکلا ہے۔ چھینٹے اڑاتا مست سناتا

چلاجا رہا ہے۔ دوسری طرف بربادیٔ جہان آباد سے دل میں کسک سی پیدا ہوگئی ہے۔ شعر آفریں دماغ ہے۔ مصائب روزگار دیکھ کر پھٹ پڑا بہہ نکلا۔ سینہ کی سیاہیاں دھوتا خس وخاشاک بہاتا چلاجا رہا ہے۔

اس کے علاوہ صاحب کمال ہر حال میں اپنا کمال دکھاجاتے اور منواجاتے ہیں۔ اور جن میں جوہر ذاتی کی کمی ہوتی ہے۔ وہ متمدن زمانہ کی امداد کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

جس طرح سچا ہیرا تہ خاک بھی چمک دے جاتا ہے۔ اور امیٹیشن خوشنما کیس خوبصورت جڑائی اور بجلی کی روشنی کا محتاج رہتا ہے اور اس فضا کے باہر اس کی روشنی ماند پڑجاتی ہے حقیقت کھل جاتی ہے۔ اسی طرح مصنوعی ادیب متمدن زمانہ کے دست نگر ہوتے ہیں۔ جبکہ محض جوہر ذاتی برسر مقابلہ نہیں آتا بلکہ تمدن کے دوسرے آلۂ کار بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً دولت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ غدر سے پہلے جو واہ واہ شہزادوں کے لچر پوچ اور بے معنی اشعار پر ہوتی تھی۔ بڑے سے بڑے شاعر اس تحسین وآفریں سے محروم نظر آتے تھے۔ آج بھی آپ کے ہاں ایک مثل اس حقیقت کو واضح کررہی ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام۔

اس قسم کے مصنوعی جواہر متمدن زمانہ میں امن وامان کے زیر سایہ دولت وثروت کے پرتو میں اپنی جھوٹی چمک دمک دکھاتاج ادب میں جگہ پالیتے ہیں۔ لیکن جب وہ فضا ختم ہوجاتی ہے۔ زمانہ رنگ بدلتا اور ان جواہرات کو تنقید کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو یہ مصنوعی سنگ ریزہ شیشہ کے ٹکڑے سارے تاج کی قدر وقیمت گھٹادیتے اور اس کو اہل نظر کی نظروں سے گرادیتے ہیں۔

یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ مالکِ تاج ونگیں اپنے رنگ میں تھے۔ اہل دربار کے رگ وپے میں نمک حرامی اور غداری سرایت کرگئی تھی۔ امرائے مردِ افگنِ عیش ونشاط کا شکار۔ شاعر بھی اسی محفلِ رنگ وبو میں تھے۔ خم کے خم لنڈھاتے جام پر جام چڑھاتے۔ رونق بزمِ رندانہ تھے۔ اپنے سماج کا نقشہ کھینچ گئے اور آنے والی نسلوں کے لئے مسموم فضا چھوڑ گئے۔

بڑے میاں سر جھکائے بیٹھے تھے کہ نوجوان نے ایک اور ورق الٹا۔

غدر پڑچکا ہے۔ عیش کی راتیں گذر چکی ہیں۔ مصیبت کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ دلّی آباد ایک افسانہ ہے۔ دلی برباد ایک حقیقت۔ نازوں کے پالے ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ پھولوں میں تُلنے والے خوار ہو گئے ہیں۔ ہُن برسانے والے ہاتھ مٹھی بھر اناج کو محتاج۔ شاہزادہ شارع عام پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ وارث تاج و تخت کشکولِ گدائی لئے پھر رہے ہیں اور وہ بھی خالی۔ راجہ نل بھیک مانگ رہا ہے اور اُسے مانگے نہیں ملتی۔

دلّی کا سہاگ اجڑ چکا ہے اس کا ساجن بچھڑ چکا ہے۔ عمر رسیدہ۔ کمر شکستہ دولہا حجلۂ عروسی سے اُتار دیا گیا ہے۔ نیا نوشاہ اس چھپر کھٹ کی آرائش پیروں تلے مل رہا ہے۔

نام کے بہادر شاہ کی عروس سلطنت غریب کی جورو سب کی بھابی بنی ہے۔ کالے لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ گورے اپنا سکہ جما رہے ہیں۔

شاہِ وقت عروس سلطنت کی آبرو نہ بچا سکا۔ اس کی آبرو ریزی کی جا رہی ہے دولت بھی لوٹی جا رہی ہے۔ عزت بھی۔ اور عصمت بھی۔

شہر کربلا بنا ہے۔ ہر گھر ماتم کدہ۔ بازار بند پڑے ہیں۔ گلی کوچوں پر مردنی چھائی ہے۔ گھر گھر سناونی آئی ہے۔

ایک گھر میں میاں تین وقت بعد ٹکڑا کھانے بیٹھا ہے۔ روٹی نصیب تھی۔ پر طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ چاہنے والی بیوی نے کم مسالہ پتلے شوربے کا قلیہ اپنے ہاتھ سے پکایا تھا۔ ابھی اس نے نوالہ توڑا ہی تھا کہ باہر سے سگے سسرے تشریف لائے۔ بنایت موٹے۔ سیاہ فام۔ لال لال دیدے جیسے دہکتے ہوئے انگارے۔ تیز بڑے بڑے سفید دانت۔ داماد نے سلام کیا۔ بیٹی ایک طرف کو ہو بیٹھی۔ سسرے نے داماد کو درازیٔ عمر کی دعا دی اور فرمایا۔ بیٹا ذرا باہر جا کر دستخط کر آؤ سرکاری آدمی کھڑے ہیں۔ داماد اُٹھنے کو تھا کہ بیٹی نے کہا۔ یہ ذرا کی ذرا کھانا کھالیں۔ آج تین وقت بعد شوروہ چپاتی نصیب ہوئی ہے۔ چاہنے والا باپ بولا۔ ایک منٹ میں آکر کھالیں گے۔ کھانا

بھاگا نہیں جاتا۔ وہ غریب بھوکا باہر گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ بیوی دسترخوان بچھائے بیٹھی رہی پر میاں وہاں گیا تھا جہاں سے پھر آنا محال تھا۔

باپ کا ایک منٹ کچھ اس قیامت کا تھا کہ وہ ختم نہ ہوا اور دھولے ہو گئے کیس۔

سونا لینے پی گئے اور سونا کر گئے دیس سونا ملا نہ پی ملے مرے دھولے ہو گئے کیس

یہ منظر دیکھنے کے بعد نوجوان نے بڑے صاحب کی طرف دیکھا اور کہا۔ خون سفید ہو گئے تھے۔ قلب سیاہ۔ نقش وفا نقش باطل ہو گیا تھا۔ محبت حرفِ غلط۔ مہر کی مہر دلوں پر ثبت تھی۔ ہوس زر نے اندھا کر دیا تھا۔ غضب خدا کا حاکم کی خوشنودی کے لئے تھوڑا سا روپیہ حاصل کرنے کو چار دن کی آسائش کے واسطے سگی بیٹی کا سہاگ اجاڑ دیا۔ باپ نے بیٹی کی چوڑیاں اپنے ہاتھ سے توڑ دیں اور کچھ اس طرح کہ غریب کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور پھر زخم سدا خون دیتے رہے ان لوگوں کی محبت اشعار تک رہ گئی تھی۔ ان کی ماتا جادو چھلوں وہ لوگ اس دور میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے تھے۔ سیرت انسانی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے انسانوں کی چلتی پھرتی بولتی چالتی مورتیاں رہ گئی تھیں انسانیت سے معرّا۔ قالب تھے بے روح۔ جسد تھے بے جان کاغذ کے پھول تھے خوشبو سے خالی۔ یہ کہہ کر نوجوان نے صفحہ سفید پر نگاہ ڈالی۔

جیل خانہ کی کوٹھریاں ہیں۔ سیاسی قیدی بھوک ہڑتال کر رہے ہیں۔ ایک بنگال کا ہے ایک پنجاب کا۔ ایک سندھ کا ہے۔ ایک مدراس کا۔ نہ رشتہ ہے نہ ناتا۔ نہ جان نہ پہچان۔ لیکن ہر ایک کو اس پر اصرار ہے کہ اگر دوسرا روٹی کھائیگا تو میں بھی کھاؤں گا ورنہ نہیں۔ بقائے حیات کے لئے ڈاکٹر مصنوعی طریقوں سے بزور و زبردستی غذا پہنچا رہے ہیں۔ لیکن یہ جان دینے والے آن جانے نہیں دیتے۔ دم توڑ رہے ہیں پر نوالہ توڑنے کو راضی نہیں۔

نوجوان کے چہرہ پر خون دوڑا ہوا تھا۔ اس نے ان بزرگوار کیطرف دیکھا اور کہا۔ کہئے ایمان سے ان دونوں تصویروں میں کونسی انسانیت کی مکمل تصویر ہے اور کونسی حیوانیت کا مرقع۔

بڑے میاں سرنگوں بیٹھے تھے نوجوان نے انکی طرف دیکھا اور کہا قسم ہے ملک اور قوم کی عزت کی۔ ہم ہیں ملک کے سپوت۔ ہم میں صفحہ تاریخ کے زرّین حروف وہ تھے کلنگ کے ٹیکہ بدنامی کے بدنما داغ۔ نوجوان نے ایک اور صفحہ الٹا۔

شرفا کے محلہ میں ایک مکان ہے دروازہ پر باغِ حسن لکھا ہے یہ عشرت کدہ طوائف کا گھر ہے۔

ایک مردِ معقول ادھیڑ عمر تشریف لائے چہرہ سے وجاہت پوشاک سے ریاست ٹپکتی ہے۔ ساتھ ایک نوعمر نونہال بھی ہے۔

کواڑوں پر دستک دی۔ زبردستی اور عصمت فروشی نے خیر مقدم کیا ہاتھوں چھاؤں لیا۔ یہ اندرونِ خانہ داخل ہوئے۔

اس باغ کے غنچہ بادِ صبا سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ گل ہو جاتے ہیں۔ دست مشاطہ پھر کلی بنا دیتا ہے۔

یہاں کے سرو پر مارِ سیاہ لئے پھرتے ہیں قمری آشیانہ نہیں بنا سکتی۔

عارضِ گل کی حفاظت باغبانِ چشم کرتا ہے جس کا قلب سیاہ ہے۔

اس باغ کی نرگس کور نہیں وہ بیک نگہ غلط انداز اندھیر مچاتی ہے۔ دنیا کو سیاہ کار بناتی ہے۔

عناب کے پردہ میں بیضۂ مار پرورش پاتے ہیں۔

یہاں لوحِ برگ پر چشمِ فلک آنسو بہاتی ہے لکھا نہیں مٹا سکتی تر دامن کر جاتی ہے اس گلشن کا ہر پھول نافرمان ہے۔ پتہ پتہ سم خوردہ سم آلود سبز باغ دکھا کر نامہ اعمال سیاہ کرتا ہے۔

اس گلبن میں غنچہ چاک چاک تا سحر تر دامن رہتا ہے۔

یہ وہ مکتب ہے جہاں ہمارے نونہال تربیت پاتے ہیں یہ وہ جہانِ عیش ہے جہاں ہماری قوم کے نام لیوا ننگ و نام لٹاتے ہیں۔ چمن قوم کے معصوم غنچہ اس عالم رنگ و بو میں رنگے جاتے ہیں۔ قوموں کے قبرستان میں پرورش پاتے ہیں۔

عیش دنیا سے ہو گیا دل سیر　　دیکھ کر رنگ عالم فانی

اب نوجوان نے صفحۂ سفید کی طرف اشارہ کیا۔

ایک عالیشان عمارت نظر پڑی کہ اس میں چھوٹے چھوٹے بچے چڑیوں کی طرح چوں چوں کرتے جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔

دروازہ پر مادر وطن کے نبض شناس قوم کے مایۂ ناز رہنما۔ طبیب حاذق مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب ہاتھ میں ' اسم ذالک الکتاب لاریب فیہ ہدیً للمتقین ' لئے یہ آوازِ بلند فرما رہے ہیں۔

' ما مسلمانان دریں دورِ حاضرہ احتیاج داریم کہ دستے را بدامن تعلیم عصری و دست دیگر را بدامنِ تعلیم مذہبی بر زنیم۔ تا جوانان ما کہ تعلیم را بحد تکمیل رسانیدہ از مدارس بیروں برآیندہ حظے از دنیا و نصیبے از دین داشتہ باشند۔

اس دروازہ کے بعد ایک اور ہے۔ اس پر کندہ ہے۔ از کلید دین در دنیا کشاد۔ سامنے مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ کھڑے فرما رہے ہیں۔

ذرہ از سوز نوا ایم زندہ گشت　　پر کشود و کرمکِ تابندہ گشت

صلائے عام دے رہے ہیں اور بہ بانگ دہل کہہ رہے ہیں۔

سرِّ عیش جاوداں خواہی بیا　　ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

نوجوان نے مرد بزرگ کی طرف دیکھا اور کہا۔ یہ ہماری درسگاہ ہے وہ ان کی درسگاہ تھی وہاں ان کو روباہ روی سکھائی جاتی تھی یہاں ہم کو اسد اللہ کی پیروی۔

بڑے میاں بولے اُس دور میں بھی ہونہار بروں کی کمی نہ تھی۔ بجھیرا پلٹن کو دیکھو ایک ایک نونہال خاک وطن کو سرخ رو بنا گیا دادِ وفا دے گیا۔ حق نمک ادا کر گیا۔

نوجوان نے جواب دیا آپ سچ فرما رہے ہیں۔ خدا ان نونہالوں کو جوار رحمت میں لے اور ہم گناہ گاروں کو بھی ان کی سی توفیق عطا فرمائے۔ وہ خارستان میں گل تھے۔ جو چمن کو چندے منور کر کے گل ہو گئے۔ ان غنچوں کی ہر پنکھڑی کتاب حیات کا پر سبق ورق تھی۔ ان کی مختصر فرصت زندگی عرصۂ ہست و بود کی مکمل درسگاہ ان کے خون کا ہر قطرہ مادر وطن کے لئے

غازہ تھا۔ وہ بے مثال سپوت وطن پرستوں کے لئے مثال چھوڑ گئے۔

ہم یہ کب کہتے ہیں کہ ہندوستان میں سعید ارواح آنی بند ہو گئیں تھیں۔ کہنا تو یہ ہے کہ ماحول اس درجہ مکدر تھا کہ صحیح فطرت پر غلط قالب چڑھ جاتا تھا۔ ان نونہالوں کو باد زہر آلود نے نہیں چھوا تھا۔ فطرت اپنا رنگ دکھا گئی۔

بندہ پرور اس دور کے افراد پر تعیش اس درجہ مسلط ہو گیا تھا۔ اُن کے دل و دماغ پر عیش نے اس قدر اپنا سکہ جما لیا تھا کہ وہ گناہ کو گناہ نہ سمجھتے تھے اس دور میں صرف گناہ گار نہ تھے بلکہ خود گناہ معاشرت اور معیشت کا ایک جزو لاینفک بن گیا تھا۔

کوئی صاحب ثروت اس وقت تک مستند رئیس نہ کہا جاتا تھا جب تک کہ اس کے پاس کوئی طوائف ملازم نہ ہو۔ امراء۔ روساء اور شرفا کی صحبتوں میں منشیات کی تو اصبح عام تھی۔

چاوڑی بازار حسن کی منڈی جو ہمارے بزرگوں کی قدر شناسی کی بدولت بازار سر پر چشمک زن رشک قاف اور ہم رنگ مخمل بنا تھا۔ شوقین مزاج ہوس پرستوں کی آماجگاہ تھا۔ روز شام کو یہ دستور تھا کہ پوشاک بدل چھیلا بن گھوڑوں پر ادھر جاتے۔ مرکب کو الٹ کر طوائفوں سے پان لیتے۔ سرخ رو ہوتے گل گشت کرتے گذر جاتے تھے۔

ان پر فسق و فجور اس درجہ طاری تھا کہ علی الاعلان بہانگ دہل کرتے تھے۔ یہ آبرو باختہ جسد فروش ننگ نسائیت ان کو اتنی محبوب تھیں کہ اپنے گھر کے چشم و چراغ اپنی قوم کے نام لیوا آنکھیں بند کر ان کے حوالہ کر دیتے تھے ہائے وائے کور چشمی۔

اتنا کہہ نوجوان نے ایک اور ورق الٹا

ماں اولاد کو بیچ رہی ہے رانی راج کو۔ دھرم پتنی پتی کو دھوکا دے رہی ہے۔ غلط اصلاح کاروں کے ہاتھ میں پھنسی ہے۔ میاں سے دغا کر رہی ہے۔ رعایا سے غداری۔ کیا زمانہ ہے بہو کا ہاتھ اپنے سرتاج کے سر سے تاج اتار رہا ہے۔ نام کی حکومت کے لئے تیمور کی ہڈیاں فروخت کی جا رہی ہیں۔

لال قلعہ پر گولہ مارا جا رہا ہے۔ نمک حرام نمک خواروں نے دشمنوں کو بتا دیا ہے کہ رنگ محل پر زیادہ گولہ باری کی جائے۔ بیگم نے زمین آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ ماں میٹھ مچا رہی ہے۔

چاہیتی بیگم اپنا سنگار اُجاڑے۔ بال بکھیرے۔ سوانگ بنائے گریبان چاک پریشان حال بیٹھی۔ میاں کا دامن پکڑے ٹسوے بہا رہی ہیں۔ یہ اصرار ہے کہ اس لال حویلی کو آگ لگاؤ ہم کہیں جنگل میں جا پڑینگے۔ یہ ہر گھڑی کی دھائیں دھوئیں سے میرا دل دہلا جاتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اتنے میں ایک اور گولہ پھٹا۔ بیوی میاں سے لپٹ گئیں اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ گلاب سے چہرہ پر کیسر پھول گئی۔ ہاتھ پیر سرد پڑ گئے مُردنی چھا گئی۔

چاہنے والا میاں عورت کی باتوں میں۔ دغا کی گھاتوں میں آ گیا۔ تیمور کا وارث قلعہ چھوڑ قبروں پر جا پڑا۔ قلعہ دار مجاور بن بیٹھا۔ بادشاہ نے گدائی اختیار کی

اغیار کی بن آئی۔ دشمنوں کا نقشہ جم گیا۔ چال چل گئی۔ شاہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ قلعہ ٹوٹ گیا۔ وزیر مہروں کے چکر میں آ گیا۔ بازی نرغہ میں پڑ گئی۔

شاہزادے مارے گئے۔ سلاطین سولی چڑھے۔ جاں نثار جان سے گئے۔ بادشاہ گرفتار ہوا۔ غداروں کے ہاں گھی کے چراغ روشن ہوئے۔ خاندان تیموری کا چراغ جس نے عیش وعشرت سے لو لگائی تھی۔ شمع محفل بن گیا تھا۔ ایک پھونک سے گل کر دیا گیا۔

نہ وہ بزم رہی نہ وہ چراغ۔ نہ وہ محفل رہی نہ وہ شمع۔

اچھا ہوا نہ وہ بزم رہنے کے قابل تھی نہ وہ محفل۔ وہ چراغ گل گیر کو دعوت دے رہا تھا۔ گل ہو گیا بُرا نہ ہوا۔ اس محفل میں اہل محفل مطلب آشنا مدعا دوست تھے۔ شمع عصمت فروش آبرو باختہ تھی۔ پروانہ مطلب کے دیوانہ۔ اس بزم کے چراغ کا دیا غریب رعایا کے کاسۂ سر کا تھا۔ روغن ان کے سینوں کی چربی کا۔ بتی کی جگہ دست کاروں کی اُنگلیاں جلائی جا رہی تھیں۔ اس چراغ کی لو گھر پھونکنے کی فکر میں تھی۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔

اس بزم کے پھولوں میں غداری اور دغا کے کانٹے چھپے تھے۔ محبت بھرے حسین ہاتھ۔ آستینوں میں چھریاں چھپائے۔ جام لالہ سینہ میں سمّ سیاہ لئے۔ ساقی مے خواروں کے خون کا پیاسا کلیاں اپنے ناشگفتہ سینوں میں ہوس زر چھپائے تھیں۔ گلے ملنے والے گلا کاٹنے کی فکر میں تھے۔

نوجوان بڑے میاں کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔
بندہ پرور آفاتِ غلامی سے وہ نسل آشنا نہ تھی۔ لذت حکومت کام و دہن بھول چکے تھے۔ گھونگروؤں کی جھنکار کانوں میں بس رہی تھی تلواروں کی جھنکار دل پر گراں گزرنے لگی نتیجہ سو ہونا تھا سو ہوا زمانہ نے سلاسلِ غلامی جھنکار کو ان کے خواب گراں کی تعبیر بنایا۔
بادہ نوش بزم عیش میں نگر خوں سے ہم کنار گل تکیوں پر سر رکھ سو گئے تھے۔ گھر میں چور گھس آئے تمسکات سمیٹ لئے۔ اول تو نشیبہارے چیتے ہی نہیں اور چیتے تو بیکار۔ ابھی تک خمار تھا۔ طبع عالی کسل مند سر گرانی تھی۔ اعضاء شکنی۔ ابھی چور گھر میں موجود تھا۔ یہ متوارے لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔ معشوقوں کی باہیں گلوں میں پڑی تھیں۔ دُردِ تہِ جام ابھی باقی تھی۔ ڈکوس گئے اور پھر پڑ رہے۔ وائے ناکامی۔
اب صفحہ سفید کی طرف نظر ڈالی۔
ترک موالات کا زمانہ ہے۔ ہندوستان میں ہل چل مچی ہے۔ حکومت کی بنیادیں ڈگمگا رہی ہیں۔ استبداد کی عمارت ڈھینے کو ہے غلامی لرزہ براندام کھڑی ہے۔ غیر حکومت رخت سفر باندھ رہی ہے۔ غلام خواب گراں سے آزادی کی انگڑائی لے کر اُٹھا ہے۔ ذلت کی زنجیریں توڑ رہا ہے، بندھن دانتوں سے کاٹے ڈالتا ہے۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں کھڑا ہے اس پر رحمت کی پھوار پڑ رہی ہے۔
جنگ آزادی کے نہتے سپاہی سینہ سپر کھڑے ہیں۔ حکومت اپنے ہتھیار استعمال کر رہی ہے۔ یہ سر دے کر سلطنت لینے آئے ہیں۔ آزادی کی موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں جیل خانے بھر چکے ہیں۔ قیدی چلے آ رہے ہیں۔ دس کی گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو بیس آن موجود ہوتے ہیں۔ ذاتی آزادی بیچ کر قوم اور ملک کی آزادی خریدنے والوں نے اپنی زندگی جیل خانوں کے لئے وقف کر دی ہے۔ زنداں کو دلہن سمجھ رکھا ہے۔ سلاخوں کو سینہ سے لگا رہے ہیں۔
جو لاری قیدیوں کو لے کر جیل کے دروازے پر پہنچتی ہے اس میں سے مقررہ تعداد سے زیادہ برآمد ہوتے ہیں۔ جیلر گھبرا اُٹھے ہیں۔ حکومت کے ہاتھ پیر بھول گئے ہیں۔
ظلم کرنے والا ہاتھ شل ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ آزادی صلب کرنے والے بازو مفلوج ہوا چاہتے ہیں ہندوستانی اپنا حق لینے اُٹھے ہیں۔ مادر وطن کے سپوت اپنے جوان خون کے غازہ سے مادر وطن کو سرخ رو کرنے پر آمادہ ہیں۔ دھرتی ماتا کی زنجیریں کاٹی جا رہی ہیں اس میں ہاتھ بھی کٹ رہے ہیں اور سر بھی۔

چند اوباش چاوڑی بازار کے ایک کوٹھے پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ بازار میں سے قومی نعرہ کی آواز آتی ہے۔ رنڈی بے تابانہ برآمدہ میں جاتی ہے۔ تماش بین بھی اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جوان بوڑھے۔ بچے والنٹیر گذر رہے ہیں۔ طوائف ایک کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے۔ " میرا بھائی ہے اور ان الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے چہرہ پر قابل پرستش سرخی دوڑ جاتی ہے مرد تماشائی اس مطعون خلائق عورت کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں تونے اپنے بھائی کو کیوں بھینٹ چڑھا دیا۔ جواب ملتا ہے۔ آج وہ لطفِ جوانی ہے جو زنداں میں ہے نہیں۔ تماشائی والنٹیرز میں مل جاتے ہیں۔ جلوس گذر جاتا ہے۔ فضا میں آزادی کے نعرے گونج رہے ہیں

نوجوان کے چہرہ پر عجیب تبسم ہے۔ آنکھوں میں ایک خاص روشنی۔ بڑے میاں سے کہتا ہے دیکھا آپ نے اُس دور میں محصناتِ غیر مصافحات کی وہ ذہنیت تھی اس دور میں فاحشہ اس مقام پر ہے۔

بڑے صاحب اس تند گفتاری کی تاب نہ لاسکے بولے۔ میاں اب بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ اس وقت ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا۔ پھر ہم پوچھتے کہ بیکسی کا ساتھ ہوتا ہے۔ تم امن و امان کے زمانہ میں بیٹھے زباں زوری کر رہے ہو اس وقت کی حالت سے آگاہ نہیں۔ قیامت صغرا بپا تھی۔ نفسا نفسی کا بازار گرم۔ غدر پڑ رہا تھا۔ بے دے مچی ہوئی تھی۔ باپ کو بیٹے کی خبر نہ تھی۔ بیٹے کو باپ کی۔ جس کا جہاں سینگ سمایا۔ نکل گیا۔ جس کو جہاں پناہ ملی جا چھپا۔ رزق آگے تھا اور خلق خدا پیچھے پیچھے نہ تن کو کپڑا تھا نہ پیٹ کو روٹی۔ جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ زمین و آسمان دشمن ہو رہے تھے۔

نوجوان نے بڑے میاں کی طرف سخت نگاہ ڈالی اور کہا۔

زمین و آسمان دشمن ہوتے ہیں لیکن صرف اُس کے جو اپنے ساتھ خود دشمنی کرتا ہے۔
زمین و آسمان ہلاک کرتے ہیں۔ مگر صرف اس کو جو اپنے پاؤں میں خود کلہاڑی مارتا ہے۔
زمین و آسمان دانہ دانہ کو محتاج کرتے ہیں۔ مگر صرف اس کو جو ہاتھ پیر ہلا کر کھانا نہیں چاہتا
زمین و آسمان کو الاہنا نہ دیجئے۔ آپ خود اپنے دشمن تھے۔ آپ اپنے ہاتھ سے اپنے پیر پر کلہاڑی مار رہے تھے۔ آپ خود اپنی بربادی کے درپے تھے۔ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

بندہ نواز جب اُنھوں نے قفس قبول کیا اس وقت تک اُن کے بال و پر موجود تھے اور صیاد کے ہاتھ میں قینچی نہ تھی۔ اُن کے بازوؤں میں طاقت تھی اور پنجرہ کی تیلیاں کمزور۔ اس وقت تک اہل وطن کے پاس ہتھیار بھی تھے اور آزادی بھی۔ ایمان کی یہ ہے کہ ان کے پاس سب کچھ تھا ہاں خواہش پرواز نہ تھی۔ ہمیں خواہش پرواز ہے۔ پر پرواز نہیں۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم پیدا پنجرہ میں ہوئے ہیں۔ بال و پر بریدہ بازو شکستہ پھر بھی ان ننھے بازوؤں کو پھڑپھڑا رہے ہیں اور پیش رفتگان نے صحیح سالم بال و پر ہلائے تک نہیں۔ ہم تو قیدی ماں باپ کے ہاں جیل خانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ مورد الزام تو وہ باہمت بزرگ ہیں۔ جنھوں نے آزادی عیش و عشرت کی بھینٹ چڑھادی اور قید قبول کی۔

محترم بندہ ایک سوداوی امراض مول لیتا ہے اُس کو خدا بیٹا دیتا ہے۔ لیکن ہونے والے کے بدن پر بدنما گٹھلیاں ہیں۔ لڑکا جوان ہوتا ہے اور وہ گٹھلیاں جان کے ساتھ ہیں۔ باپ اس بدنصیب لڑکے کے سرہانے کھڑا کہہ رہا ہے کہ ناشدنی تجھ جیسے بدہیئت کو مجھے ساتھ لے جاتے ہوئے اور اپنا بیٹا بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ تیرے بدنما داغ مکروہ غدود میرے واسطے باعث ننگ و عار ہیں۔ جس وقت اس باپ نے یہ مرض مول لیا تھا اُس کو خواہشات نے اندھا کر رکھا تھا۔ اب خودستائی نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ وہ غفلت پرست بھول گیا کہ یہ روگ اس کا ورثہ ہے جو بیٹے کو پہنچا ہے۔ لڑکا غریب ناکردہ گناہ باپ کے گناہوں میں گرفتار ہے۔

حضور ہم کو غلامی پیش رفتگاں سے ورثہ میں ملی۔ اُنھوں نے خریدی تھی پھر بھی وہ اچھے اور ہم بُرے اگر یہی آپ کا انصاف ہے تو ہمارا اور آپ کا انصاف اُس دن ہوگا جس دن میزان کے پلڑے میں نہ کچھ ڈالا جا سکے گا نہ نکالا جا سکیگا۔

آج ہم اور وہ، پر بحث ہے ۔ مجمع کثیر ہے ۔ لوگ دُور دُور سے آئے ہیں ۔ جناب صدر حضرت دانش تشریف لائے مجمع پر خموشی چھا گئی ۔ نہایت پاٹدار آواز میں فرمایا ۔ حاضرین اوّل تو اجازت دیجئے کہ اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کروں جو جناب نے ایسے اہم جلسہ کا صدر منتخب کر کے مجھ ناچیز کو بخشی ہے ۔

ایک عرصہ سے ملک میں یہ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ پیش رفتگاں بہتر تھے یا ماضی قریب اور حال کے لوگ بہتر ہیں ۔ مصباح صاحب تجویز پیش کریں گے اور زمانہ حال کی حمایت فرمائیں گے ۔ جناب مصباح صاحب ۔

ایک نوجوان کھڑا ہوا ۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے ایک بزرگ نے فرمایا ۔ اپنے موضوع کو محدود کئے بغیر ہم کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکیں گے ۔ لازم ہے کہ 'ہم اور وہ' کا تعین زمانی کر دیا جائے ۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ 'ہم' سے کون لوگ مراد ہیں اور 'وہ' کی ضمیر کس طرف اشارہ کر رہی ہے ۔

نوجوان نے عرض کیا کہ کسی دور کی ذہنیت کا اندازہ لگاتے ہوئے سختی کے ساتھ تعین زمانی کرنا ناممکن ہے ۔ یہ واقعات نہیں، جن کی تاریخیں مقرر کی جا سکیں ۔ یہ ذہنی ارتقاع اور ابتذال کے حالات ہیں ۔ ان کو تاریخوں کی سخت حدود میں محدود کرنا نفس مدعا کھو دینا ہے تاہم تقرر وقت ایک حد تک ضروری ہے، لیکن نہایت نرم اور لوچدار حدود کے ساتھ ۔ بندہ نواز 'وہ' سے مراد وہ لوگ ہیں جو ۱۸۵۷ء میں کم از کم چالیس کے تھے اور اُن کے بعد کے سب 'ہم' میں شامل ہیں ۔

محفل میں سے ایک بزرگ نے فرمایا ۔ کیا معزز محرک اس کی کچھ وجہ بھی بیان فرمائیں گے ۔ کہ یہ چالیس کی قید کیوں لگائی گئی ۔

نوجوان نے جواب دیا ۔ جن لوگوں نے کہ ایک خاص زمانہ میں عمر کے کم و بیش چالیس سال گزارے ہوں ان کو اس زمانہ اور اس دور کا بڑی حد تک صحیح نمونہ کہا جا سکتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ اس فضا میں پلے بڑھے پروان چڑھے اس عہد کی تعلیم سے کما حقہٗ مستفید ہوئے تہذیب و تمدن سے بہرہ مند اس دور کی حکومت میں عام طور پر ان کو دخل ہوتا ہے سیاست

ہیں ان کا ہاتھ دنیا کے کسی ملک کسی قوم اور کسی دور کو لے لیجئے آپ اس کلیہ کو کار فرما پائیں گے۔ یعنی چالیس اور چالیس سے متجاوز عمر کے لوگوں کو ہر شعبہ میں دخیل ملک وملت کی رہنمائی کرتے دیکھیں گے۔

جناب صدر نے دریافت کیا کہ نفسِ تجویز کے الفاظ ہیں تو اب کوئی بات استفسار طلب نہیں۔ مجمع نے جواب دیا نہیں۔

اب محرک نے تجویز کی حمایت میں تقریر شروع کی۔

جناب صدر۔ ہم سب کو آج تک ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ متعدد بار یہ سننے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ پیش رفتگاں بہت اچھے تھے اور تم بہت بُرے ہو۔ قرب قیامت ہے۔ رفتار زمانہ زوال پذیر۔ دنیا والے خرابیوں کی طرف مائل۔ روبہ انحطاط ہیں۔ جو دن گزر گئے غنیمت تھے۔ حال ناگفتہ بہ اور مستقبل بد سے بدتر نظر آتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کیا یہ سچ ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا درحقیقت ہم اُن سے بُرے ہیں جو آزاد پیدا ہوئے اور غلام مرے کیا درحقیقت وہ نسل ہم سے بہتر تھی جس نے سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہ کیا یا یہ نسل فی الحقیقت بُری ہے جو باوجود بے دست و پائی کے ہاتھ پیر ہلا رہی ہے اور قفس کی تیلیوں سے جو سختی سے سخت تر ہوگئی ہیں منقار و بازو زخمی کئے لے رہی ہے اور اس جراحت میں لذت حاصل کرتی ہے کیا ہم بُرے ہیں جو غلام پیدا ہوئے اور آزاد مرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا وہ بُرے تھے جنھوں نے آنکھیں بند کر آزادی عیش کی بھینٹ چڑھا دی۔

آج ہم کو اس مسئلہ پر غور کرنا ہے۔ یہ ملک کا اہم ترین مسئلہ ہے اس کے صحیح حل میں ہماری تمام مشکلات کا حل مضمر ہے۔

ہماری تربیت یہ ہے کہ "تو در طریق ادب کوش و گو خطائے من است"۔ ہماری عمریں یہ سنتے ہوئے بیت گئیں کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ کاش ہم تھوڑی دیر کے لئے اس غلط ادب آداب کو بالائے طاق رکھدیں۔ اور اپنے اور اپنی نسل کے ساتھ انصاف کریں۔ اس ناانصافی کا ترکی بہ ترکی جواب دیں جو سالہا سال سے ہمارے ساتھ کی جا رہی ہے۔ یہ ہم اپنے لئے نہیں کر رہے ہیں۔ اپنی اولاد کے لئے کر رہے ہے۔ اپنی آنے والی

نسلوں کے لئے کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی اس قوم کے لئے کر رہے ہیں۔ جس کے سامنے عرصہ حیات بے میعاد ہے۔ ہم کسر نفسی اور مردہ پرستی سے ہاتھ چھڑا کر عدل کا دامن پکڑتے اور ببانگ دہل کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا ورثہ متولیوں نے اپنی رنگ رلیوں کی نذر کر دیا۔ اولین انسانی حق یعنی آزادی گروی رکھدی۔ ہمارے ہاتھ پیر تک بیچ کر مزے اُڑا گئے۔ دو راتیں عیش کی گزاریں اور ہم کو ہمیشہ کے لئے گنونڈا بنا گئے۔ اپنی سیاہ کاریوں کی بدولت ہم کو بخت سیاہ دے مرے۔ مجلس عالم میں روسیاہ کر دیا ہمارے ماتھوں پر کلنگ کا ٹیکہ لگا دیا ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔

اگر ایک باپ اپنی عیش پرستی۔ سہل انکاری اور تن آسانی کی بدولت تمام موروثی ملک ختم کرنے کے بعد اپنی اولاد کو فروخت کر دیتا ہے کہ وہ ساری عمر غیروں کی غلامی کرے تو دنیا اس کو بُرا کہے گی اور ضرور بُرا کہے گی۔ پس اگر ایک فرد کی یہ حرکت قابل لعنت ہے تو ہم اس نسل کو بُرا کہتے ہوئے جھجکتے ہیں جس نے پوری قوم کی یہ حالت کر دی۔

یہ پس و پیش بیجا تکلف۔ مکلف زندگی بسر کرنے والے بزرگوں کی مسموم میراث ہے اسے چھوڑ دو ہم حق گوئی سے کیوں پرہیز کرتے ہیں۔ ہم حقیقت پر پردہ کیوں ڈالتے ہیں۔ ہم جو سچ سمجھتے ہیں بے محابا کیوں نہیں کہدیتے۔

ہم کو دنیا میں ترقی کرنی ہے۔ اور ترقی حق اور حق پرستی سے ہوتی ہے۔ ہم دروغ گوئی نہیں کریں گے۔ ہم کاذب نہیں ہیں۔ ہم سچ کہیں گے ہم راست کہیں گے بے کم و کاست کہیں گے خواہ وہ ہمارے بڑوں کے خلاف کیوں نہ ہو۔

موجودہ نسل کے نوجوان ترقی کے علم بردار۔ راستی و راست بازی کے پرستار قوموں کی عدالت کے سامنے گواہ کی حیثیت سے بلائے گئے ہیں۔ حلفیہ بیان دینا ہے۔ ہم سچ کہیں گے ہم کسی کی پردہ داری نہیں کریں گے۔ ہم اپنی اولاد کی عقلوں پر پردہ نہیں ڈالیں گے ہم انصاف کا خون نہیں ہونے دیں گے ہم سچ کہیں گے۔

سارا مجمع چیخ اُٹھا " ہم سچ کہیں گے۔"

مقرر نے مجمع کی جانب نگاہ ڈالی اور کہا۔

ہم میں ایسے بھی ہیں جو ایمان داری سے ان کو اچھا سمجھتے ہیں جن کو میں بڑا کہہ رہا ہوں ان اچھوں کی چند خصوصیات آپ کے روبرو بیان کرتا ہوں اگر میں غلط بیانی سے کام لوں تو مجھے ٹوک دیجئے گا۔ روک دیجئے گا۔ بے تکلف کہہ دیجئے گا کہ تو غلط کہہ رہا ہے۔ مرے ہوؤں پر تہمت اُٹھا رہا ہے۔ الزام لگا رہا ہے اور اگر میں سچ کہوں۔ خدا لگتی کہوں۔ حق کے مطابق کہوں ہمیشہ کے لیے مان لیجئے گا۔ کہ وہ درحقیقت بُرے تھے جن کو ہم اچھا سمجھے بیٹھے ہیں۔ جن کی قبروں کی خاک ہم آج بھی سر پر ڈالتے ہیں۔ وہ یہیں خاک بسر کر گئے۔ جن کو ہم اچھا کہتے اور اچھا سمجھتے ہیں وہ یہیں دنیا بھر سے بڑا بنا گئے۔ ایمان سے کہئے کیا یہ صحیح نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو تربیت کے واسطے رنڈیوں کے ہاں بھیجتے تھے۔

سامعین میں سے ایک بزرگ کھڑے ہوئے اور بولے وہ رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں۔ ان کے اخلاق و آداب قابل تقلید۔

نوجوان نے کہا وہ ڈیرہ دار سہی۔ لیکن جس عورت کے سر پر شامیانۂ عصمت نہیں وہ ننگ نسائیت ہے ان سر بازار دکانِ حسن سجانے والیوں کے اخلاق و آداب کو قابل تقلید کہنا ان ہی بزرگوں کو زیب دیتا ہے۔ جن کو دنیا بُرا کہتی ہے ان کو اچھا کہنا جن کی بابت شریعت ترک موالات کا حکم دیتی ہے جو اپنی عزت و عصمت کو علی الاعلان چاندی کی ٹھیکریوں کے بدلے دیتی پھریں ان کی ستائش میں قصیدہ خوانی اس دور کی دماغی کیفیت دکھاتی ہے۔

وہ لوگ نہ صرف گناہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کی زندگی میں گناہ داخل ہو گیا تھا۔ انھوں نے گناہ کو گناہ سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ فسق علانیہ کرتے اس کو فخر و مباہات سمجھتے تھے بداطواری ان کے دل و دماغ پر طاری تھی۔ عیاشی ان کی طبیعتوں پر مسلط۔ ایک جسد فروش طوائف کو اچھا سمجھنا اپنی اولاد کو اس کے حوالہ کر دینا ان کی مبتذل ذہنیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

وہ مر گئے اور مجھ کو مرنا ہے۔ جس عدالت میں وہ پیش ہوئے وہاں ایک روز مجھے بھی جانا ہے۔ میں غلط بیانی نہیں کر رہا ہوں میں مرے ہوؤں پر تہمت نہیں اٹھا رہا۔ آپ لوگ ایمان سے کہئے کیا یہ صحیح نہیں کہ اس دور میں ایک طوائف کا ہونا لوازمات ریاست میں

سے تھا۔ اس شخص کا شمار رئیسوں میں نہ ہوتا تھا جس کے پاس ایک رنڈی ملازم نہ ہو۔ روز شام کو ہمارے شرفا انگرکھے کے بندوں میں چمپا کے پھول باندھ کھلے بندوں چاوڑی جایا کرتے تھے۔ عیش پرستی نے اُن کو اندھا کر دیا تھا۔ بُرے اور بھلے کی تمیز جاتی رہی تھی۔ معیار اخلاق بدل گیا تھا۔ بھنگ کی تواضع عام تھی۔ افیون کی ڈبیہ امیر غریب رئیس فقیر سب کی جیب میں پڑی رہتی تھی۔ فلک سیر ایجاد ہو رہی تھی۔ منشیات پر کوئی قدغن نہ تھا۔ شراب گھروں میں کشید کی جاتی اور تحفتاً احباب کو بھیجی جاتی تھی۔ شریفوں کے گھر۔ قوم کے مدرسے۔ ملت کے قلعے۔ شراب کی بھٹیاں اور آوارگی کے اڈے بنے تھے۔ دیوان خانوں میں چوبیس گھنٹہ پانسہ پھکتا تھا۔ قمار بازی عام تھی۔ بڑے بڑے اس جرم میں ماخوذ ہوتے تھے نام لینا زیب نہیں دیتا تھا عاقلاں را اشارہ بس است۔ میں نے بڑوں سے سُنا ہے کہ ایک صاحب کے جوئے کی شہرت اتنی عام ہوئی کہ کسی شہر سے ایک شخص قسمت آزمانے بازی لگانے بہت بڑی رقم لے کر آیا۔ میاں نو وارد اپنے جوڑی دار کا گھر پوچھتے پھر رہے تھے کہ قاسم جان کی گلی کے نکڑ پر دونوں کی ملاقات ہوئی شانِ نزول معلوم ہونے کے بعد لب سڑک جوتی چیت پٹ کر لی۔ دم کے دم میں پانسہ پلٹ گیا۔ جائداد کے قبالہ نو وارد کے حوالے ہو گئے۔ اللہ اللہ کیسے جیوٹ جواری تھے۔ جوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی۔ شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی۔ پھر بھی وہ اچھے اور ہم بُرے اللہ رے خوش اعتقادی۔ مغلیہ سلطنت کے آخری چراغ حضور ابوظفر بہادر شاہ نے حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ میں بیٹھ کر حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے نانا سے کہا کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ بتا دیا گیا ہے کہ اب حکومت اس خاندان سے لے لی جائے گی۔ اس لئے جد و جہد بیکار ہے۔

یہ بات اُن کو اپنے کشف و کرامت سے معلوم ہوئی یا منجانب اللہ القا کی گئی تھی۔ جس پر ایمان لا کر اُنھوں نے مسلمانوں کی حکومت بڑوں کی امانت آنے والوں کا ورثہ ہاتھ سے گنوا دیا اور صاف و صریح احکام الٰہی کا خیال نہ کیا۔ جو تیرہ سو برس سے پکار پکار کر ایک ایک مسلمان سے کہہ رہے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ

بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۵ اور اعلان کر رہے ہیں۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط۔

جو بتا رہے ہیں کہ تم حکومت کرنے پیدا ہوئے ہو محکوم بننے نہیں۔ جو کھلے الفاظ میں جتا رہے ہیں کہ خدا کی زمین تمھاری ہے اور تم اس کے سچے وارث۔ تیغ بدست سر بکف جہاں چاہو نکل جاؤ۔ خدا تمھارے ساتھ ہے۔ اَللّٰهُ مَعَكُمْ۔ ہمت سے کام لو تاج شاہی تمھارے قدموں میں ہوگا اور تخت شاہی تمھاری ٹھوکروں میں۔ دنیا کی بادشاہت تم مسلمانوں کے لئے ہے بشرطیکہ تم رب العزت کے احکام پر چلو۔

حضور بہادر شاہ نے ذاتی انکشاف پر بھروسہ کیا اور حکم ربی کو نہ مانا یہ اس دور کی دماغی حالت اور ذہنیت کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ وہ حقیقت سے دور خواب وخیال کی دنیا میں بسر کر رہے تھے۔ کلام پاک کو بھول کر کشف و کرامت کے چکر میں پڑے تھے۔ یہ ان کے مقدر کا چکر تھا۔ جذبِ اسلام ختم ہو گیا تھا۔ شرع اسلام وہ بھی نام کو دنیا دکھاوے کو قدرِ قلیل رہ گئی تھی۔ روح اسلام ان میں سے ختم ہو گئی تھی صرف جسم رہ گیا تھا اور اس پر بھی خیر سے ایسا سونے کا پانی چڑھایا تھا وہ وہ گلکاریاں کی تھیں کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔

کلام پاک ہوا دینے کے کام آتا تھا۔ ان کو دنیا کی غلط ہوا لگ چکی تھی۔ امراء مسجدیں بنوانا ذریعہ نجات سمجھتے تھے نماز پڑھنا ان کے واسطے ضروری نہ تھا۔

مسجد تو بنا دی جلدی سے مذہب کی حرارت والوں نے۔
دل اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس دور کا انتہائی آزادہ رو اور بلند پرواز شاعر غالب کہتا ہے۔

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیان کے لئے

استاد غالب کی نگاہ بالغ و وسعت دوست جب تنگنائے غزل سے تنگ آئی اور عرصۂ کلام میں وسعت طلب کرتی ہے تو کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے ادا کرنے کو نہیں بلکہ قصیدہ گوئی شکم پری اور بیجا ستائش کے واسطے جیسا بعد کے شعر سے ظاہر ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے + سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے —— اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

جمہوریت کا تخیل اُن کو چھو نہ گیا تھا۔ وہ اس راز سے آشنا نہ تھے کہ ملک وہاں کے رہنے والوں کی مِلک ہے۔ اُس دور کا ادب ملوکیت پرستی۔ مایوسی اور پست ہمتی کی طرف لے جاتا ہے۔ افیون ہے جو قلب کی حرکت میں کمی پیدا کر کے سکون دیتی ہے۔ اس دور کا ادب آگ ہے۔ دلوں کو گرماتا۔ عمل کا سبق دیتا۔ جمہور کو جگاتا اور اُس کو اپنی ہستی سے آشنا کرتا ہے۔ کہتا ہے

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی   اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

خاکم بدہن حضرت غالب کے کلام پر اعتراض مدِ نظر نہیں۔ ہماری رائے میں وہ شاعر کی حیثیت سے جب بھی بے مثل تھے اور اب بھی بے عدیل ہیں۔ دکھانا یہ منظور ہے کہ اس زمانے والوں کے دماغوں پر عشق اور بھوک کا بھوت سوار تھا۔ یا غزل کہتے تھے یا قصیدہ حتیٰ کہ غالب جیسا آزادہ رو بھی دامن بچا کر نہ جا سکا۔

قوم پرور شاعری۔ ملت کو ارتقاع کی طرف لے جانے والے ادب سے اُن کے دل و دماغ بہرہ مند نہ تھے۔ بات یہ ہے کہ ملک پر جب ادبار آتا ہے تو ہر شعبۂ حیات پر ابتذال کا رنگ چھا جاتا ہے۔ زبان اپنا رنگ ڈھنگ بدل لیتی ہے۔ محاورے مثالیں اور کہاوتیں بزدلی کی جھلک دکھانے لگتی ہے۔

ہمارے اس دور کی یادگار آج بھی ایک مثل ہے اور ہم سب نے بڑوں کے منہ سے بارہا سُنی ہو گی۔ بازار کی گالی ہنس کر ٹالی۔ یہ نظریہ غلام قوم۔ برباد ہونے والی ملت اور فنا ہونیوالی نسل کا ہے۔ قوم کو جرأت۔ شجاعت۔ حمیت جب جواب دے چکتی ہے تو افراد ایسی اشلوں کی آڑ لیتے ہیں۔

ہمارے بڑے جب تک عزت فروش نہ تھے۔ بلکہ سرفروش تھے۔ اُن کی مثل تھی۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔ زبان کہہ کر دانتوں میں چھپ جائے گی۔ سر کے سر جائے گی۔ مطلب یہ ہوا کہ ذرا سنبھل کر زبان چلانا کہیں تلوار نہ چل جائے۔ پھر ہم نے کہنا شروع کیا کہ ایک کہو گے تو دس سنو گے۔ اب ہم زبانی جمع خرچ پر اُتر آئے۔ تیغ آبدار جو آبرو کی محافظ تھی نیام میں رکھ لی گئی اور جوہر ذاتی تیغ زبان کے جوہر تک رہ گئے۔ اس کے بعد ایک اور منزل آئی جب ہمارا قول ہوا۔ دنیا گنبد کی آواز ہے جیسا کہو گے ویسا سنو گے۔ پھر ہم کہنے لگے۔ بازار کی گالی

ہنس کر ٹالی۔ اور دیکھئے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل۔

جو رنگ قوم کے دل و دماغ پر چھایا ہوتا ہے۔ ادب اور زبان میں بھی جھلک دکھا جاتا ہے معمولی معمولی مثالوں اور محاوروں سے زمانہ کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چشم اور طبع انصاف پسند کی ضرورت ہے۔

مولانا حالی فرماتے ہیں۔

ہر چند برا ہے عشق کا سب کے مآل
پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سلطاں ہے اگر ظل الٰہی تو عشق
ہے ظل الٰہی کے لئے وقت زوال

اُن کے شاہ و گدا برنا و پیر پر عشق کی گھٹا چھائی تھی۔ سرتاجدار سے لے کر گدائے خاک نشیں تک اس قلزم میں غرق تھے۔ اندھے دیوتا کے پیچھے اندھے ہو رہے تھے۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ غدر سے کچھ پیشتر۔ پیرانہ سالی میں حضرت ابو ظفر بہادر شاہ کی نظر کرم ایک سیاہ فام ہم رنگ شباب شب دیجور رشک بخت سیاہ عاشق بھنڈہ برداری پر پڑی اور اس کو محلوں میں داخل کر لیا گیا۔ شاید ہم آجکل کے لوگ بھنڈہ برداری کے معنی نہ جانتے ہوں۔ بندہ نواز۔ حقہ چلم کا انتظام رکھنے والی کو بھنڈ۔ برداری کہتے ہیں۔ حیف صد حیف تاج ہمایونی کے وارث۔ افسردہ ہو گئے تھے۔ بھنڈہ برداری پر نظر رکھتے تھے۔ عروس سلطنت سے ہم آغوشی فراموش کر چکے تھے۔ حقہ کے دم میں آگئے تھے۔

اگر کوئی صاحب اس روایت کو معتبر نہ سمجھیں تو ناصر نذیر فراق صاحب کی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" اُٹھا کر دیکھ لیں۔ مصنف قلعہ معلیٰ کی تباہی اور آل تیمور کی بربادی پر ہر ہر لفظ میں اشک خون روتا معلوم ہوتا ہے

شاید آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس دور کے بے فکرے کیا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اگر اجازت ہو تو بتا دوں۔ خیر سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر انڈے لڑائے جاتے تھے۔ اللہ اللہ کس قدر مردانہ مشغلہ تھا۔ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ گندے انڈے رہ گئے تھے انڈے لڑایا کرتے تھے۔

یہ سُن کر مجمع میں سے ایک بزرگ کھڑے ہوئے۔ کچھ کہنے کو تھے کہ نوجوان نے ہاتھ کے اشارہ سے روکا اور کہا۔ قبلہ مجھ کو معلوم ہے آپ جو فرمائیں گے۔ جناب کا خیال ہے کہ بھلا کھیل کو

ذہنیت سے کیا واسطہ۔ ماروں گھٹنہ پھوٹے آنکھ۔ سوال از آسمان۔ جواب از ریسمان۔

جناب عالی قدر قوم کے کھیل ملت کی ذہنیت اور دماغی نشو ونما میں اس درجہ دخیل ہوتے ہیں کہ اس حقیقت سے انکار کرنا ماہ نیم ماہ اور مہر نیم روز کو چشم بینا سے نظر انداز کرانا ہے۔

مولانا شوکت علی مرحوم سے جب وہ سرکار انگریزی میں ملازم تھے ایک بزرگ سال انگریز افسر نے دریافت کیا کہ اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا باغی کون ہے۔ مولانا نے اپنی رائے کے مطابق کسی سربرآوردہ قومی لیڈر کا نام لیا۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا باغی وفاداروں کا وفادار سید احمد خاں ہے۔ جب مولانا نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو اُس نے جواب دیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان مسلمان جو علی گڑھ میں وہی تعلیم پا رہے ہیں جو ہمارے لڑکے ونچسٹر اور ہیرو میں پاتے ہیں۔ جو انُ ہی کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اور انہی کے کھیلوں میں انھیں ہرا سکتے ہیں اس بات پر قانع ہوں گے کہ جب وہ سویلین بن کر ہندوستان آئیں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوں تو ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہوں اور جی حضور اور بجا ارشاد ہوا اُن کے روبرو کہا کریں۔ نہیں شوکت علی صاحب ہندوستان میں اب انگریزی حکومت کے دن نہیں رہے۔ اور یہ آپ کا چوٹی کا وفادار سید احمد خاں ہی ہے۔ جو آج سب سے بڑا باغی ہے۔

سو بندہ نواز۔ قوم کی ذہنیت بنانے میں قومی کھیلوں کو بہت بڑا دخل ہے۔ کھیل کے میدان میں نوجوان مقابلہ کے اصول۔ یک جہتی کے فوائد سیکھتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں ہم کو Teamwork (ٹیم ورک) آتا ہے جس کے بغیر قوم کی گیند دائرہ مقصود تک نہیں پہنچتی۔ ملت کی گاڑی دَل دَل میں سے نہیں نکل سکتی۔

انگریزی زبان میں ایک بہت مشہور جنگی نظم ہے جس میں تمام استعارات کرکٹ کے ہیں۔

BUMPINIG PITCH and BLINDING LIGHT TEN TO MAKE and THE LAST MAN IN PLAY UP PLAY UP and PLAY THE GAME.

شاعر کہتا ہے پچ یعنی زمین بھی ہمارے خلاف ہے اور آفتاب بھی۔ جتنے کے لئے دس رنین بنانی ہیں اور آخری آدمی کھیلنے گیا ہے۔ موقع شناس کپتان کی ہدایت ہے کہ کھیل کھیل اطمینان

قلب کے ساتھ کھیل - طریقہ سے کھیل -

بندہ نواز - عرصہ حیات - تماشاگاہ عالم - کھیل کا میدان ہے - صحیح کھلاڑی بازی لے جاتا ہے غلط کھیلنے والا ہاتھ خالی رہ جاتا ہے - ہمارے پیش رفتگان نے کچھ ایسے کھیل کھیلے کہ کھیل بگڑ گیا -

شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ورثائے تاج و تخت بزرگوں کی وصیتوں کو تبرک سمجھتے تھے - ترکہ کو بھول گئے تھے - تبرک سے دل بہلاتے رہے - حکومت بھی بقدر تبرک رہ گئی کہ از گلو فرو نرود -

مصوری اُن کا دن رات کا مشغلہ تھا - دست قضا نے فرمان حکومت مٹا دیا اور یہ بیٹھے حسینوں کی تصویریں بناتے رہے - عروس سلطنت رم کر گئی اور یہ کور چشم آہو چشموں کے مرقعے تیار کرتے رہ گئے -

کیا زمانہ تھا - مریخ فلک نے عطارد کی جگہ سنبھالی تھی - قسمت کی تحریریں بدل دینے والے ہاتھ کاغذ پر گل بوٹے بنا رہے تھے -

صفحۂ زمین کو زخم خندان سے سرخ رو بنانے والے کاغذ سیاہ کر رہے تھے - وصلیاں لکھ رہے تھے -

سینہ کو چمن بنانے والے گل کھانے گل کھلانے والے نونہال سینۂ قرطاس پر گل کاریاں کر رہے تھے - دستِ شاہی نے تیغ موشگاف رکھ کر موقلم اُٹھالی تھی ..... وہ بھول گئے تھے کہ

ملک را گر قرار خواہی داد تیغ را بے قرار باید کرد

اس دور کے امراء - روسا - اور شہزادہ موسیقی سے شوق رکھتے تھے - میراثیوں کی صحبت میں میراثِ حقیقی کو فراموش کر چکے تھے - تخت طاؤس کو بھول کر طاؤس رباب اور دلربا سے دل بستگی پیدا کر لی تھی - ضربت شمشیر کے عادی مضراب سے ساز باز کر بیٹھے - فلک فتنہ ساز راگ لایا - یہ اپنی دھن میں بیٹھے رہے - اُدھر موسیقار فلک نے دیپک چھیڑ آشیانہ کو آگ لگادی -

رونا یہ ہے کہ وہ آشیانہ صرف اُن کا نہ تھا جو وہ پھونک گئے - اس میں کچھ

انڈے تھے کچھ بچے جب یہ سوختہ سامان بڑے ہوئے تو آشیانہ خاک سیاہ ہو چکا تھا۔ اور اُن کے بال و پر جھلسے ہوئے تھے۔ یہ بے گناہ بچے عرصہ حیات میں نشیمن سوختہ سبلے پروبال داخل ہوئے۔ تگ و پے میں بہت گھسٹے والے پیچھے رہ گئے۔

ایمان کی یہ ہے کہ بڑوں نے محفلیں رچا رکھی تھیں۔ آب آتش کا دور چلتا تھا۔ شمع رو رقص کرتے۔ آتش بیان گرم گفتاریوں سے محفل کو گرماتے۔

آتش خورہ آگ سے کھیل رہے تھے۔ آخر گھر پھنک گیا اور یہ تماشہ دیکھتے رہ گئے۔ خود نشہ میں چور تھے اذیت کو محسوس نہ کر سکے۔ لیکن اس گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ جو جھلس گئے۔ اپاہج ہو گئے اور بے دست و پائی کی زندگی رینگ رینگ کر بسر کرنے لگے۔

جن کے بزرگ بزم طرب میں خم کے خم لنڈھاتے تھے وہ آج ایک ایک قطرہ پانی کے لئے پیٹ کے بل گھسٹ گھسٹ کر جاتے ہیں جب بمشکل لب و دہن تر کر کے آتے ہیں۔

ایمان سے کہئے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ شاہوں نے سلطنت لٹا دی۔ ان کی اولاد شہزادے ایک ایک روپیہ اور آٹھ آٹھ آنے وظیفہ وصول کرنے مہینہ کے مہینہ کچہریوں میں جاتے ہیں اور بذلت و خواری اپنی قسمت کا لکھا پاتے ہیں۔

جن رئیسوں اور امیروں نے پھول والوں کی سیروں میں دس دس اور بیس بیس ہزار روپیہ پھونک دیئے آج اُن کی اولاد تیس دن اپنی ہڈیاں پیلتی ہے جب مہینہ پر دس بیس روپیہ کما کر لاتی ہے۔

جن شریفوں امیروں نے ایسی ایسی شادیاں رچائیں کہ باید و شاید۔ مہینوں توڑ بندیاں کیں۔ آٹھوں اڑوں محفلیں رہیں۔ باولیاں میٹھی کر دیں۔ اُن کی محفل اجڑ گئی۔ پس ماندگان نانِ شبینہ کو محتاج رہ گئے۔ آج ان کے گھر غمی ہے اور کفن خیرات کا آیا ہے۔

اس سب کے بعد بھی اگر آپ اُن کو اچھا اور ہم کو بُرا سمجھتے ہیں تو اس کچھ پر آنے والی نسلیں لعنت بھیجیں گی۔

شاید یہ بات بھی آپ نے نہ سُنی ہوگی کہ اس دور میں شاہ اور شاہزادہ جم جم کھانا پکانے کا شوق رکھتے تھے۔ یہ ہنڈیا ڈوئی کی فکر میں رہے اور ہر خوان سلطنت الٹ گیا۔

نئے نئے کھانے ایجاد کیئے جاتے تھے۔ مثلاً مرچوں کا دلمہ۔ کریلوں کا حلوہ۔ فلک فریب کار نے آنکھوں میں مرچیں جھونک دیں اور یہ اللہ کے شیر مرچوں کے دلمہ پکاتے رہے۔ تلخیٔ روزگار مقدر ہوگئی اور یہ کریلے کے حلوے کے مزے میں لب بند میٹھے رہے

یہ کہنا کہ ان فروعات کا ذکر بیجا ہے۔ سخت غلطی ہے۔ انسان کی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا فعل اس کی دماغی کیفیت اور ذہنیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

واقعات حیات پر غور کرنے والا دماغ۔ ان ظاہرا چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتیجہ نکالتا ہے۔ مثلاً اس ذرا سی بات سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ لذت کام و دھن ان پر مسلط تھی۔ جن کے بزرگ وسط ایشیا میں گھوڑے کا خون پی کر نبرد آزمائی کے طریقہ ایجاد کرتے تھے۔ اُن کے عیش پرست وارث کھانا پکانے کی ترکیبیں ایجاد کرنے لگے۔

پیش رفتگاں کے دل و دماغ لذت حکومت سے آشنا تھے۔ اُن کو للو کا چٹخارہ مرغوب جو اُنھوں نے کاخ حکومت کی بنیاد ڈالی اُنھوں نے بنی بنائی عمارت ڈھادی۔

تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے۔ شیر شتر اور سوسمار پر گذر بسر کر کے اہل عرب نے جہاں گذران کی باگیں دست قدرت میں لے لیں۔ اور مرغن و مقحم دعوتوں میں ہاتھ مارنے والے ایرانی خوان حکومت سے تہی دست اُٹھائے گئے۔

ان باتوں کو چھوٹی باتیں نہ سمجھئے یہ فروعات جڑ کی خبر دیتی ہیں۔ یہ ذرا ذرا سی باتیں قومی ذہنیت کے سانچے ہیں۔ ان کی درستی قوم کی درستی اُن کا بگڑ جانا قوم کی بربادی کا باعث۔

میں صفحہ تاریخ کا ایک خونیں ورق الٹنے والا ہوں۔ میں وہ زخم عریاں کرنے والا ہوں جو آج تک مرہم سے محروم پس پردہ پڑے سڑتے رہے۔

نشتر کے ڈر سے بیجا حجاب کے مارے ہمارے حیا پرور بزرگوں نے سارے جسم کو مسموم کر لیا۔ لیکن ان زخموں کو ظاہر نہ ہونے دیا جو ملک کی فضا کو متعفن کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں اس زہر آلود صفحہ کو الٹوں اپنے بزرگوں سے یہ عرض کر دینا

چاہتا ہوں کہ میں ان زخموں کو اپنا زخم اور اپنے بزرگوں کا زخم سمجھ کر کھول رہا ہوں۔ میں جو بُرے جراح کو مہر پدر اور شرم مریض پر ترجیح دیتا ہوں۔ میرا اعتقاد ہے کہ ورثہ کی حقیقت سے وارث کو پوری طرح آگاہ کر دیا جائے۔ گھر کا کونہ کونہ موجودہ مالک کو دکھا دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کی اس کی حقیقت اور کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھ لے۔ ہم اپنی اولاد کو دنیا میں اندھا بنا کر چھوڑنا نہیں پسند کریں گے۔ پھر ہم اپنی نسل کی آنکھیں کیوں نہ کھول جائیں۔ اُن کو کیوں نہ جتا دیں کہ تمھاری موجودہ حالت اِن اِن وجوہ سے ہے۔ تمھارے بزرگوں نے احتیاط نہ برتی تم ان کے نقش پا سے بچکر چلنا۔

واقعات تاریخ کو اپنی آنے والی نسلوں سے چھپانا ان کو انسانی ورثہ سے محروم رکھنا ہے۔ ان کو آثار الصنادید کے مکتب سے بے بہرہ کرنا ہے۔

یہ اوراق ایک نہ ایک دن پریشان ہونے تھے۔ ان سیاہ کاریوں کو روز روشن میں عریاں ہونا تھا۔ ان صفحات کو خوش اعتقادی اور بزرگ داشت کی سنگین جلدیں دست روزگار کی دست بُرد سے بچا نہ سکتی تھیں۔ اب یہ میری خوش قسمتی سمجھئے یا کم طالعی کہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔ جو کام ایک نہ ایک دن ہونا تھا۔ دست قضا نے میرے ہاتھ سے کرایا۔

میرے بزرگ مجھ کو اجازت دیں کہ میں اب وہ منظر دکھاؤں جس کے لئے ہمارے دیدہ و دل تیار نہیں اس سچ کو پیش کروں جس پر ہم جھوٹ کے پردہ ڈالتے چلے آئے ہیں۔ وہ دور دکھاؤں جس سے پیر فلک کو دوران سر ہو جائے۔

یہ صحیح کہ اس حقیقت کی عریانی سے ہماری بزرگ پرستی کو ایک دھچکا لگے گا لیکن شاید اس صدمہ سے ہماری آنکھیں کھل جائیں اور ہماری آیندہ نسلیں دنیا میں آنکھوں والی بن کر جئیں۔

جوان مرد شیر دل بیٹا باپ کو شیر کی موچھ کا بال کھلا رہا ہے۔ باپ بیٹے کو اپنے ہاتھ سے زہر پلا رہا ہے۔ باپ بچ جاتا ہے۔ بیٹا قدموں میں گر کر مر جاتا ہے۔

بیٹے نے باپ کی دعوت کی ہے۔ حضور بہادر شاہ شہزادہ کیومرث کے مہمان ہیں

بزم طرب آراستہ۔ موسیقی کا دریا ٹھاٹھ مار رہا ہے۔ قلزم عیش دلوں میں تلاطم بپا کر رہا ہے۔ سرودِ مطرب نغمۂ انجم کے منھ آرہا ہے۔ لولیانِ شوخ و شنگ بوئی فلک کو دنگ کر رہی ہیں۔ رقاصہ کی گردش گردشِ روزگار سے کم نہیں۔ تاج و تخت کو ٹھکراتی نظامِ عالم زیر و زبر کرتی گھونگھٹ کی گت سے عقل و خرد پر پردہ ڈالتی۔ حواس و ہوش چکراتی گردش میں ہے۔

دامن پیری دستِ شباب میں ہے۔ خدا خیر کرے۔

باپ بیٹے ایک حمام میں ہیں آبرو کا اللہ مالک۔

عروسِ سلطنت بوڑھے باپ سے کنارہ کش ہونا چاہتی ہے۔ جوان ہمت بیٹا اس سے ہم کناری پر آمادہ ہے۔

دامن سلطنت بیٹا باپ کے ہاتھ سے چھین رہا ہے۔ دامنِ محبت تار تار ہوا جا رہا ہے۔

بزم عیش زوروں پر ہے سعادت مند بیٹا باپ کو بڑے مان سے پان دیتا ہے۔ اس میں شیر کی مونچھ کا بال ہے۔ شیشۂ دل میں بال پڑ گیا۔ جڑ نہیں سکتا۔

آج باپ نے غسل کیا ہے۔ بیٹا سرور بار طلب کیا گیا ہے۔ سعادتمند بیٹے کو چاہنے والے باپ نے اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ دیا۔ لڑکا پی گیا بیٹا باپ کے قدموں میں جان دے رہا ہے۔

یہ اُن کی اولاد ہیں جو بیمار اولاد کے صدقہ ہو کر جان دیا کرتے تھے۔ وہ محبت کی نیو پر حکومت کی بنیاد رکھ گئے اِنھوں نے نفرت کے پھاوڑوں سے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

اس دور میں۔ پسران را ہمہ بدخواہ پدر می بینم۔

میرے خوش اعتقاد بزرگ پرست بزرگ شاید اس حقیقت سے واقف نہیں کہ حضور بہادر شاہ وہی تخت نشین باپ ہیں جو زمانۂ ولی عہدی میں اپنے باپ کی نزع کے وقت اس اُلجھن اور کشمکش میں تھے کہ اس کی آنکھ کسی طرح بند ہو اور ان کا بختِ خوابیدہ جاگے ڈاک بٹھا رکھی تھی۔ پیک پر پیک چلا آتا تھا۔ پل پل کی خبر پہنچائی جا رہی تھی۔ چاہنے والا بیٹا چشم براہ اور گوش بر آواز تھا کہ کب باپ کا سایہ سر سے

اُٹھے اور میں تاج سر پر رکھوں۔ یہ وہی جلد باز لڑکا ہے جس نے صبح ہونے دن نکلنے کی راہ نہ دیکھی باپ کی شمع حیات گل ہوتے ہی قندیلیں روشن کرا دیں اور تخت پر ہو بیٹھا۔

ابوظفر بہادر شاہ جو تیری آرزوئیں تھیں وہی اس کی۔ جو تیری تمنائیں تھیں وہی اس کی فرق اتنا تھا کہ تو نے معاملہ وقت پر چھوڑ دیا۔ اس نے وقت پر قابو پانا چاہا۔ باپ کا مرنا تو بھی چاہتا تھا۔ اور یہ بھی عروس سلطنت کا تو بھی طلبگار تھا۔ اور یہ بھی حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی اور ہی سے ہم کنار تھی تم سب اس کی نعش کو گلے لگائے پڑے تھے۔

تم سب فریب خوردہ تھے۔ سلطنت کب کا تم سے دامن چھڑا کر کسی اور مرد کے دامن سے وابستہ ہو گئی تھی۔ تم اس کے جسد بے جان پر مردار خوار گدھوں کی طرح لڑ رہے تھے اور مردانہ وار حکومت چھین لینے کی تم میں ہمت نہ تھی۔ وہاں تلوار چلانی پڑتی تھی اور یہاں شیر کے بال اور زہر کے پیالہ سے کام چل جاتا تھا۔ تم نے اس حقیقت کو پس پشت ڈالدیا تھا کہ تلوار کی بے قراری میں ملک کو قرار آتا ہے۔

زمانہ کیومرث کو ناخلف بتاتا ہے۔ حالانکہ اس کو ناخلف بنانے والے بہادر شاہ کی تاریخ کے شروع اوراق ہیں۔ تاریخ اپنے صفحہ الٹتی ہے۔ ایک ورق پر بہادر شاہ اکبر ثانی کا مرنا چاہ رہا ہے۔ دوسرے ورق پر کیومرث بہادر شاہ کی موت کا طالب ہے۔

میں اپنے بزرگوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا کلام الٰہی میں یہ الفاظ صاف و صریح نہیں ہیں کہ جس نے ایک نفس کو بھی بغیر حق قتل کیا وہ ایسا ہے جیسے اس نے بنی نوع انسان کو قتل کیا۔ اور کیا شہنشاہ وقت احکام شرعی کے خلاف سزائے موت دے سکتا ہے۔ کیا شرعِ اسلام اقدام قتل پر قتل کی سزا روا رکھتی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ہمارے فقیر منش درویش صفت خدا پرست دنیا سے متنفر شاہ نے سگے بیٹے کو کس قانون کس شرع اور کس مذہب کے تحت زہر کا پیالہ دست مبارک سے پلایا۔

کیا اس حقیقت کو سننے اور سمجھنے کے بعد بھی ہم اُن کو خدا پرست فقیر منش اور باشرع کہہ سکتے ہیں بات یہ ہے کہ ہماری پرورش اس فضا میں ہوئی ہے کہ وہ اچھے تھے اور ہم بُرے جب سے ہوش سنبھالا اپنی برائیاں اور اُن کی خوبیاں سنتے آئے ہیں اس وجہ سے

ہماری نظریں اس طرف نہیں جاتیں۔ اگر اس غلط عینک کو اتار کر نگہۂ غایت سے دیکھیں تو اُن کی حقیقت کھل جائے گی اور ہم اپنی حقیقت کو سمجھ جائیں گے۔

خدارا اب اس کوتاہ بینی اور تنگ نظری سے باز آئیے۔ واقعات کو تنقید کی بے لوث کسوٹی پر کسئے۔ کھرے اور کھوٹے کی تمیز کیجئے۔ اچھے بُرے کو پہچانئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہم بہت اچھے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ان عیش پرست بزرگوں سے جنھوں نے سب کچھ آنکھوں پر پٹی باندھ کر گنوا دیا۔ بدرجہا بہتر ہیں۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم قوم پرستی کے پتلے ہیں ہاں اس کا دعویٰ دار ضرور ہوں کہ اب ہم میں احساس ملی پیش رفتگان سے بہت زیادہ ہے۔

میرا یہ دعوی نہیں کہ ہم میں نری خوبیاں ہی ہیں۔ اور اُن میں محض بُرائیاں تھیں۔ ہاں اس کا مدعی ہوں کہ ہم میں خوبیاں زیادہ ہیں اور برائیاں نسبتاً کم۔ اُن میں بُرائیاں زیادہ تھیں اور خوبیاں کم۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم نے بُرائیاں یک سر دھو ڈالی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ ہمارے دلوں میں آزادی کا طوفان موجزن ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا ۔۔۔ تموّج کا جس میں نہ ہرگز پتہ تھا
تغیر سے یہ حال اس کا ہوا تھا ۔۔۔ کہ مکروہ تھی بو تو کڑوا مزا تھا

ہوئی تھی یہ پانی سے زائل روانی
کہ مشکل سے کہہ سکتے تھے اس کو پانی

پر اب اس میں رو کچھ کچھ آنے لگی ہے ۔۔۔ کناروں کو اُس کے ہلانے لگی ہے
ہوا بلبلے کچھ اُٹھانے لگی ہے ۔۔۔ عفونت وہ پانی سے جانے لگی ہے

اگر ہو نہ یہ انقلاب اتفاقی
تو دریا میں بس ایک تموّج ہے باقی

اتنا کہہ نوجوان اپنی جگہ جا بیٹھا اور حضرت یاس نے تجویز کی مخالفت میں تقریر شروع کی۔

حضرات! معزز محرک نے اپنی تحریک کو اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ سامعین ان کی جادو بھری تقریر کے اثر سے مدہوش ہو کر اپنا متاع عقل و خرد اُن کے حوالہ کرنے کو تیار ہیں اور سوائے آمنّا و صدّقنا کے مُنھ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کوئی حربہ ایسا نہیں ہے کہ جو معزز محرک نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے میں استعمال نہ کیا ہو۔ تشبیہ و استعارہ ابہام و مبالغہ محاورہ روزمرہ فصاحت و بلاغت غرض کہ شمشیر زبان کو تیز اور کارگر کرنے کے جتنے گر تھے۔ معزز محرک نے سب استعمال کر لئے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنی طرف کرنے کے لئے ایسے چبھتے ہوئے فقرے استعمال کئے گئے ہیں جن سے اُن کے بحر احساسات میں ایک طلاطم پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو علم بردار لشکر انقلاب سمجھنے لگیں اور حق پرستی کے دلدادہ اور ترقی حق کے خواستگار ہو کر اپنے بزرگان سلف اور مرے ہوئے باپ دادا کی قبروں میں کیڑے ڈالیں اُن کو علی الاعلان شراب خوار۔ بھنگڑ۔ افیمی۔ قمار باز۔ بدکار۔ عیاش کم ہمتے۔ سہل انگار کہیں اور اس تبرے کی بدولت اس روسیاہی کا بدلہ لیں جو مجلس عالم میں نامراد رفتگان کی سیہ کاریوں کی وجہ سے نوجوان طبقے کو نصیب ہوئی۔ معزز محرک نے سب سے بڑا ایک حربہ استعمال کیا ہے کہ تصویر کا صرف تاریک رخ ہی دکھایا ہے۔ جس میں اس قدر رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے کہ سیاہی کے دھبوں کے سوا، کچھ نظر ہی نہیں آتا گویا کہ رفتگان کی دنیا میں بدکار و سیاہ کاروں کے سوا سرے سے کوئی نکوکار تھا ہی نہیں۔ نہ اس زمانے میں بزرگان دین تھے۔ نہ کوئی پرہیزگار تھا نہ کوئی حق پرست تھا نہ کسی نے اپنے وطن اور آزادی کے لئے تلوار چلائی اور نہ حق پر جان دی۔ دشمن آیا اور ان افیمیوں نے پینک میں اپنی گردنیں جھکا دیں اور نوجوانوں کا ورثہ بغیر اُن سے مشورہ کئے دشمن کے حوالہ کر دیا۔ شیر کو زنجیروں میں جکڑ ڈالنا۔ اور پنجرے میں بند کر کے دکھانا ہر مصور کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن اگر قلم دوسرے کے ہاتھ میں ہو تو وہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھا سکتا ہے روز جلوہ ہائے حسن مغرب کے شیدائی ایک ریسٹران میں یا کسی مال زادے نوجوان کی عالیشان کوٹھی کے عشرت فشاں ہال میں بادۂ عشق و بربط مستی کے دو آتشے سے مخمور۔ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت کے نشے میں چور چند شمعہائے کافوری یعنی بتان فرنگ۔ بلوریں پہ پروانہ وار نثار

ہوتے رہتے ہیں اور اس شعلۂ جوالہ کی آتش جہاں سوز میں اپنی جوانی۔ اپنی دولت۔ اپنی آبرو۔ اپنی خودداری اپنی وطن پرستی اپنی آزادی۔ غرضیکہ تمام ان خوبیوں کو جن پر نوجوان دنیا کو ناز ہے ایک عالم بے خودی میں نذر آتش کرتے رہتے ہیں۔

نوجوانوں کی دنیا کی عیاشی میں نہ صرف بتانِ فرنگ بلکہ مہوشان ساڑھی پوش حور وشاں ابرو پر دوش جن کو سوسائٹی گرلز کہا جاتا ہے معتد بہ حصہ لیتی ہیں اور عشق بازی کو فن لطیفہ کا معزز نام دیا جاتا ہے۔ "ہم" افیم و بھنگ کو برا سمجھتے ہیں مگر کوکین کا شوق کرتے ہیں ہم معمولی جوا نہیں کھیلتے مگر گھوڑ دوڑ کا فیشن ایبل جوا بطور تفریح جائز سمجھتے ہیں۔ پہلے لوگ گناہ کو گناہ نہ سمجھتے تھے۔ "ہم" نے گناہ کو فن لطیف اور ایک سائنس بنا دیا ہے۔ پہلے گناہ شرع کی زد میں آتا تھا۔ اب گناہ کو اپنی شرع کی رو سے جائز قرار دے دیا گیا۔ پہلے مسلمان مسجد میں آتے تھے اور نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اب ہم ٹوٹی پھوٹی خالی خولی مسجدوں پر لڑتے ہیں مگر اُن کو آباد نہیں کرتے۔ وہ آزاد پیدا ہوئے اور آزاد رہے اور آزاد مرے "ہم" غلام پیدا ہوئے اور غلامی ہم میں اتنی رچ گئی کہ ہم کو اصلی آزادی کا احساس ہی نہیں رہا اور جس آزادی کے لئے کہا جاتا ہے کہ بلبل نے قفس کی تیلیوں سے سر مارتے مارتے اپنے آپ کو زخمی کر لیا وہ آزادی لوہے کے پنجرے سے نکل کر ایک سونے کے پنجرے میں منتقل ہو جاتا ہے وہ سیہ کار تھے عیاش تھے۔ مگر کشمیری دروازے کے باہر فتح گڑھ کے منارے کے پاس اُن کی وطنی جانبازی۔ اور ان کی شجاعت و جواں مردی کی اسناد خود دشمن کے ہاتھ سے خدا نے کندہ کرا دی ہیں کہ اگر "ہم" کبھی بھولے بھٹکے ادھر سے گزر جائیں تو ہم کو معلوم ہو جائے کہ ان گرم ہمت لوگوں میں کس قدر ہمت تھی کہ مر تو گئے مگر مرتے مرتے کس طرح دشمن کو تلوار کے گھاٹ اتار گئے اور فنا و السقر کر گئے۔ دلی شہر کا ایک ایک بازار اُن کا ہل سہل انگار عیش پرست افیمی مردہ پرست رفتگان کی شمشیر آزمائی کا شاہد ہے۔ جب تک ان بہادروں کے دم میں دم رہا اور ہاتھ میں تلوار وہ دلی کے چپے چپے کے لئے لڑتے رہے اور دشمن کو دلی میں گھسنے کی ہمت نہ ہوئی جب تک کہ اس کو یہ یقین نہ ہو گیا کہ ان جاں بازوں کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے۔ لیکن دغا کے سامنے بہادری

کیا کر سکتی ہے۔ جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے تو بہادر شاہ ایسا نادان نہ تھا کہ باعزت صلح کے لئے آمادہ نہ ہو جاتا آج کل باعزت پسپائی قابل فخر ہے مگر وہ اگر باعزت صلح کے لئے تیار ہو جائیں تو بھی وہ کم ہمتے اور قابل ملامت دلی کی آزادی۔ بہادر شاہ کے زمانہ میں نہیں چھنی وہ تو خود پنشن خوار تھے صرف نام کے بادشاہ تھے دلی کی اور سارے ہندوستان کی آزادی تو عہد نامہ بکسر کی رو سے شاہ عالم نے گروی رکھدی تھی۔ بہادر شاہ نے تو گروی چھڑانے کی آخری کوشش میں شرکت کی تھی۔ ہارا تو ہارا سہی لیکن ۔ ع ۔ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔

مگر واہ رے شان حق نوازی و راست گوئی کہ "ہم" بہادر کو بزدل کا خطاب دیتے ہیں۔

اس وقت تک میں نے معزز محرک کے دلائل کا جواب دیا تھا۔ میں وہ اور ہم" کے موضوع پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ برنا و پیر کی باہمی رقابت ازل سے چلی آتی ہے اور ابد تک یوں ہی چلی جائے گی۔ کیونکہ یہ قانون قدرت ہے۔ قدرت نے بعض قابلیتیں جوان کو عطا کی ہیں جن کے معدوم ہونے سے جوان بڈھا کہلانے لگتا ہے جوان میں طاقت ہوتی ہے چستی و چالاکی ہوتی ہے اس کا سینہ امنگوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے ماضی سے اُسے کم واسطہ پڑا ہے اس لئے وہ شاہراہ زمانہ پر چلتے ہوئے آگے ہی کو دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے ایک لمبا راستہ طے کرنے کو پڑا ہے وہ پیچھے مڑ کر کیوں دیکھے اگر دیکھے بھی تو اُسے دکھائی کیا دیگا۔ جب وہ صرف چند منزل ہی طے کر چکا ہے۔ اس لئے جوان مستقبل ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیتا ہے۔ بوڑھا برخلاف اس کے چلتے چلتے تھک گیا ہے اُس نے اتنا راستہ طے کر لیا ہے کہ باقی کا راستہ بس نام ہی کا رہ گیا ہے وہ رہ رہ کر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور نوجوان سے بھی کہتا ہے کہ دیکھ میں کس کس سخت گھاٹیوں اور کانٹے دار جھاڑیوں میں سے گزرا ہوں۔ سامنے سے یہ ہری نظر آتی ہیں مگر جب تمھارا ان میں سے گذر ہوگا۔ تو تم اس سبز باغ کو بھول جاؤ گے۔ دیکھو میرے تجربے سے فائدہ اُٹھاؤ اور سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاؤ۔ یہ بات جوان کی سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ ماضی کے حالات جسے تجربہ کہتے ہیں اس کے چشم دید نہیں ہیں اس کی طبیعت کی بے چینی اس کی فطرتی اُمنگ اس کا اپنی قوت بازو پر بھروسہ اس کو اپنے بڈھے۔ کمزور قوار والے

بزرگ کی نصیحت سننے سے باز رکھتا ہے اور وہ ایسے کام کر گزرتا ہے کہ بڈھا بھی عش عش کرنے لگتا ہے۔ لیکن کام کرنے میں اُس کو بڈھے کی بہت سی نصیحتوں کا پچ ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ جوانی میں قوت جسمانی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر تجربہ و تحمل کم بڈھے کی ذہنی و دماغی قوت، مدت استعمال سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس اختلاف کے دونوں کا مل کر کام کرنا منشا حقیقی کو پورا کرنا ہے۔ قوموں اور ملکوں کے زوال کے اسباب کے متعلق مجھے معزز محرک لے اس دعوے سے ہرگز اتفاق نہیں ہے کہ محض اخلاقی کمزوریاں قوموں کے زوال کے باعث ہیں اخلاق کا دارومدار مذہب پر ہے۔ جو لوگ مذہب کے قائل نہیں وہ اس کے اخلاق کے بھی قائل ہیں یعنی وہ شراب بھی بکثرت پیتے ہیں۔ جُوا بھی کھیلتے ہیں سیہ کار و عیاش بھی ہیں لیکن بایں ہمہ وہ عروج پر ہیں اور مادی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے زوال کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ تاریخ میں زیادہ مثالیں اسی قسم کی ملیں گی کہ عیاش قوموں کو کامیابی ہوئی اور دیندار اور نیک قومیں پسپا ہو کر غارت ہو گئیں۔ مادی طور پر اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر باوجود عیاشی نبرد آزمائی کے جملہ انتظامات اور ضروریات کو پورا کر لیا جاوے تو کامیابی اس فریق کی ہوگی جس کا جنگی نظام بہتر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عیاشی کی بے حد زیادتی کا نتیجہ خراب ہوگا۔ مگر حدود کے اندر رہنے والی عیاشی جنگ پر کبھی اثر نہیں ڈالتی برخلاف اس کے دنیا میں بڑی بڑی بہادری کے کارنامے عیاشی کے سلسلہ میں ہی ہوئے ہیں۔ زر۔ زن۔ زمین۔ تینوں عیاشی کے خزانے ہیں۔ اور ان ہی پر تمام جنگوں کا دارومدار رہا ہے باوجود ان تمام عیوب کے جن کا ذکر محرک صاحب نے کیا۔ اگر "وہ" جنگی نظام کی طرف توجہ کرتے اور اگر دشمن کا جنگی نظام ان سے بہتر نہ ہوتا تو وہ ہرگز نہ ہارتے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ میرے اس بیان سے آپ غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں۔ میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اخلاقی ممنوعات بے معنی ہیں۔ اور عیاشی اچھی چیز ہے میں نے اس مسئلے کا محض مادی نقطہ نظر پیش کیا ہے جس کی مثالیں تاریخ میں عام ہیں۔ افسوس ہے کہ مضمون بہت طویل ہو گیا۔ لیکن اتنا کہنے کی مجھے اور اجازت دیجئے کہ انسان بحیثیت انسان کے غلطی کرتا ہے اور اگر وہ غلط نہ کرتا تو انسان نہ ہوتا اب وہ انسان خواہ بڈھا ہو خواہ جوان۔ خواہ موجودہ نسل کا ہو یا گزشتہ

نسل کا فلطی کرے گا پر کرے گا - اس کلیہ کا مد نظر رکھتے ہوئے یہ بہت نا انصافی ہے کہ معدودے چند انسانوں کے گناہوں کا یہ الزام ایک قوم کی قوم اور ایک پوری نسل پر اس طرح لگا دیا جائے کہ ان میں سے سب قابل گردن زدنی ہیں

ہر زمانے میں بُرے لوگ بھی ہوتے ہیں اور بھلے بھی اسی طرح ہر عمر کے لوگ بھلے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی - اس لئے یہ کہنا غلط اور ناجائز ہے کہ "وہ" سب کے سب بُرے تھے اور ہم سب کے سب اچھے ہیں -

آج سے چالیس پینتالیس سال قبل جب موٹروں کا زور نہ تھا نواب ممتاز حسین خاں والیٔ پاٹودی کو ہم نے چھکڑی میں نکلتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگ پوچھا کرتے تھے کہ یہ کون ہیں دلی میں نواب علاؤ الدین خاں نیر رخشاں کے انتقال کے بعد کوئی اس ٹھاٹھ کا رئیس نہیں ہوا - آخر وقت تک گھروں میں ہزار آٹھ سو سال کی کھرچنیں باقی تھیں - دل بُجھے اور بادۂ شبانہ کا خمار موجود -

بعد میں دولت دنیاوی بھی نہ رہی اور دولت دینی بھی - غدر سے صدیوں پہلے اسلام صرف فرائض پنجگانہ پر محدود ہو چکا تھا اور ہزاروں احکام میں سے صرف ان چند پر کفایت کر لی گئی تھی یہ بھی اپنی معنوی حالت پر قائم نہ تھے - اعضا اور جوارح کی حرکت کا نام عبادت رہ گیا تھا لیکن یہ جو کچھ بھی تھا نہ ہونے سے بہتر تھا - اس پر پچاس ساٹھ فی صدی پابندی تھی - تیس چالیس فی صدی تو اب ہمارے سامنے تک آج سے چالیس سال قبل تک تھی - جواب گھٹے گر پندرہ بیس فی صدی رہ گئی ہے -

بندہ نواز مسلمانانِ ہند کا زوال ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۴۷ء میں بھی وہی دورِ زوال چل رہا ہے - زوال ابھی ختم نہیں ہوا - ابھی زوال کی انتہا نہیں ہوئی - ابھی اور زوال ہونا ہے - دورِ عروج میں آپ یقیناً ہم سے آگے ہوتے - دور زوال ہے - اس لئے زوال میں آپ ہم سے آگے ہیں انتہائے زوال قریب ضرور ہے - انتہائے زوال کے بعد آپ دوبارہ اُبھرتے ہیں یا ہمیشہ کے واسطے آپ کا نام صفحۂ ہندوستان سے صفحۂ اسپین کی طرح مٹ جاتا ہے - اس کا علم اللہ ہی کو ہے -

میں مسلمانوں کی موجودہ نسل کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ اور میں نے اپنے سے پہلی نسل بھی دیکھی ہے۔ میں نے انھیں دیکھا ہے جو ۱۸۵۷ء میں بچے یا بوڑھے تھے۔ میرے بچپن میں ۱۸۵۷ء کے بچے میرے سامنے جوان اور ادھیڑ تھے اور ۱۸۵۷ء کے بوڑھے ہپ ہپ کرتے تھے۔ میں ان کی تڑپ اور ان کی بے چینی کا آپ کی تڑپ اور آپ کی بے چینی سے کیا مقابلہ کروں۔ آفتاب سلطنت کا غروب اُن کی آنکھوں میں پھرتا تھا۔ مردوں ہی کا نہیں عورتوں کا جمانیں دینا انھیں یاد تھا۔ گری پڑی حالت میں بھی ۱۸۵۷ء کے مسلمان بادشاہ تھے۔ اپنے گھروں کی چہل پہل ان بزرگوں کے قلوب سے محو نہ ہوئی تھی۔ آپ برسات کے صرف گیت سنتے ہیں۔ انھوں نے برساتیں منائی تھیں آپ کے دلوں میں اُن کی سی ہوک کیسے اٹھ سکتی ہے۔

جہاں تک دولتِ علم کا سوال ہے موجودہ نسل اپنی تعلیم اپنی تاریخ اور روایات سے بے خبر ہے۔ دوسروں کا علم پڑھتی ہے۔ دوسروں کی روایات سنتی ہے اور دوسروں کی تاریخ جانتی ہے۔ موجودہ زمانے کے بی اے اور ایم۔ اے پاس ہندو مسلمان نوجوانوں سے اگر پوچھا جائے کہ سعدی اور جامی اور خسرو اور مولانا روم اور فردوسی اور حافظ اور کالی داس اور کبیر داس اور تلسی داس کب تھے۔ اور انھوں نے کیا کیا لکھا اور کہا تو یہ نوجوان منھ تکتے رہ جائیں گے اور انگلستان اور فرانس اور جرمنی کے شاعروں کا ذکر کرنے لگیں گے کہ ہم تو بس ان کو جانتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔

آخر میں میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر معزز محرک کے جواب دینے کی بہادر شاہ کو اجازت مل جائے تو وہ فرمائیں گے۔

آ سناؤں تجھ کو میں دردِ وطن کی داستاں
اک شبِ ظلمات ہے یا قسمتِ ہندوستان
آ دکھاؤں تجھ کو اپنا پارۂ چاکِ جگر
دیکھ حالِ ملک و ملت بند آنکھیں کھول کر
آئینہ میں دل کے عکسِ حسرتِ تقدیر دیکھ
اک چراغِ یاس میں صد شعلۂ تدبیر دیکھ
زخمہائے سینہ میں پیکانِ جور و غم بھی دیکھ
دل کے پھوٹے آبلوں میں ناوکِ پُرسم بھی دیکھ

جب حضرت یاس اپنی تقریر ختم کر چکے تو جناب صدر کی اجازت سے محرک نے جوابی تقریر شروع کی۔

مصباح صاحب۔
جناب صدر۔

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

میں نے وہ موضوع چھیڑا ہے جو سخت خاردار ہے۔ ڈرتا ہوں کہ آبرو تار تار نہ ہو جائے۔ لیکن ایمانداری سے اپنے کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ اپنی سمجھ مطابق اپنوں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

میں دادا کی برائی پوتے کے سامنے کر رہا ہوں۔ لیکن اس کی بھلائی کے لئے ہیں ایک عظیم الشان جائداد کے سامنے بیٹے کو لئے کھڑا ہوں اور دکھا رہا ہوں کہ یہ جائداد تیرے دادا نے عیش و عشرت میں گنوا دی۔ امید کرتا ہوں کہ یہ دیکھ کر وہ متنبہ ہوگا۔ میری بات دل پر اثر کر جائے گی۔ جب بڑا ہوگا تو کوشش کرے گا کہ اپنا حق واپس لے۔ دادا کی داستان پوتے کو سنا رہا ہوں کہ اس کی زندگی کی کہانی افسانہ نہ بن جائے۔

جس نسل کا ذکر رہا ہوں اس نسل کے افراد کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں لیکن حقائق تاریخ پر پردہ ڈالنا اپنی اولاد کی آنکھوں پر پردہ ڈالنا سمجھتا ہوں جو کسی حالت میں روا نہیں رکھتا۔ آنے والی نسلوں کی بھلائی کے لئے اگر دنیا بھر سے برا بننا پڑے تو حاضر ہوں لیکن جو اپنا فرض سمجھتا ہوں اس سے انشاءاللہ العزیز اگر خدا نے توفیق عطا فرمائی تو پہلو تہی نہ کرونگا۔ اگر میری اس کوشش سے قوم کا ایک بچہ بھی سدھر جائے گا تو میری تمام محنت وصول ہو جائے گی اور میں کہہ سکوں گا کہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔ وما علینا الا البلاغ

میں نگہ خشمگیں اٹھالوں گا لیکن قوم کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرونگا۔ قوم کی عزت میری عزت سے زیادہ اہم ہے۔ میں ذلت کی زندگی جس پر موت کو ترجیح دیتا ہوں موت کی امید پر گذار دوں گا۔ لیکن قوم کو عزت کے ڈگر پر لگا جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ بہت کٹھن ہے ڈگر پن گھٹ کی۔ لیکن

پھرتا ہے سیل حوادث سے کہیں مردوں کا منھ — شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔ ہمارے ماضی پرست حال سے متنفر بزرگوں نے

ہم کو اتنا بُرا کہا اور اُن کو اتنا اچھا۔ ہماری اتنی ہجو کی اور اُن کی اتنی ستائش۔ ہم کو اس قدر قعرِ مذلت میں گرایا اور اُن کو اتنا بانس پر چڑھایا کہ آخر کار ہماری مردود خلائق نسل نے عقل سے کام لیا۔ اور اپنی برائیوں اور پیش رفتگان کی بھلائیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دستِ تجسس نے قبروں کے سینہ چاک کر اُن کے راز فاش کر دئے۔ گوشِ ہوش نے عمارتوں کے اینٹ پتھروں کو داستانیں کہتے سنا۔ چشمِ بینا نے فروخت شدہ جائدادوں کے قبالوں سے معاملہ کی حقیقت معلوم کر لی۔

ہم بدحال تھے۔ تو وہ خوش حال۔ ہم تہی دست و تہی کیسہ۔ اُن کے صندوقچے زر و جواہر سے بھرے ہوئے۔ ہم نانِ شبینہ کو محتاج وہ خوانِ سبعہ الوان پر متمکن۔ ہم میلے کچیلے چکٹ کپڑے پہنے اُن کی زرق برق معطر پوشاکیں۔ یہاں تن ڈھکنے کے لالے وہاں گلبدن شبنم پوش۔ یہاں قوتِ لایموت کو محتاج وہاں لنگر جاری۔ ہماری زندگی ایک مسلسل مرثیہ۔ اُن کی زندگی زندہ غزل۔ ہماری محفل میں تنگ دستی کا راج۔ ان کی بزم میں دستِ عیش دراز۔ ہمارے جلسہ قید کی دعوت۔ ان کی مجلس پیامِ عیش۔ ہماری آنکھیں اشک سے دھندلی۔ اُن آنکھیں خمار آلودِ عیش سے روشن۔ ہم کو ہر دم کل کی فکر وہ اس جھگڑے سے بے فکر اُن کے بستر پر گل تکیہ خارِ الم پر بستر اپنا۔ ہماری محفل میں سینہ فگارانِ قوم نالہائے سینہ شگاف لگاتے سُنے گئے۔ اُن کی بزم سے صدائے چنگ و نائے و نے بلند۔ گھونگروؤں کی جھنکار قلقلِ مینا نالۂ مستانہ سنائی دیا۔

وہاں زہرا کی پوجا ہو رہی تھی۔ ہم قوم کی نعش پر بنات النعش بنے بیٹھے تھے۔ یہاں عقربِ فلک ڈنک اُٹھائے کھڑا تھا۔ وہاں پیرِ فلک مینا بکف نظر آیا۔ دبیرِ فلک لفظ عیش لکھ رہا تھا۔

وہ زمانہ عیش کی راتوں کا تھا۔ ہمارا دور روزِ روشن محنت و مشقت کے لئے وہ اپنی گذار گئے ہم اپنی گذار رہے ہیں۔

وہ میخانہ بدوش تھے۔ ہم محنت کوش۔ وہ عیش پرستی کے دوش بدوش ہم قوم پرستی سے ہم کنار۔ دستِ قدرت نے اُن کو تن آسانی کے لئے پیدا کیا تھا ہم کو جفاکشی کے لئے وہ

کاخِ حکومت ڈھانے کے لئے تخلیق کئے گئے تھے۔ ہم جھونپڑیاں بنانے کے لئے۔ وہ کشت زارِ عیش سے پھل پانے کے لئے پیدا ہوئے تھے ہم زمین وطن میں ہل چلانے کے لئے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

صحیح کہ اُن کا کیا اُن کے لئے اور ہمارا کیا ہمارے لئے۔ ہم اُن کی قبروں میں نہیں جا سکتے وہ ہماری قبروں میں نہیں آئیں گے۔ جو جیسا بوئے گا ویسا کاٹے گا۔ جیسا سودا کرے گا ویسا پائے گا۔ اللہ نے ہم کو بھی ہاتھ پیر دیئے ہیں۔ اپنی عمارت خود کیوں نہیں بناتے اپنے لئے کھیت کیوں نہیں لگاتے۔

لیکن رونا یہ ہے کہ وہ دیس کی زمین اور ہمارے ہاتھ پیر تک بیچ گئے۔ سر کہاں چھپائیں جھونپڑا کیونکر بنائیں اور کہاں بنائیں۔

ملک کی زمین میں شراب کے شکستہ گلاس اور ٹوٹے ہوئے جام و مینا چھوڑ گئے ہم جب اس کو درست کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہاتھ زخمی ہو ہو جاتے ہیں۔

ہمارے سارے کھیت پر شراب بکھیر گئے۔ کھیتی کو زہر آلود کر گئے۔ ہم مٹھی بھر اناج کہاں سے حاصل کریں۔

ہمارے بڑے ہمارے ساتھ یہ سلوک کر گئے اب ایران سے کہئے اُن کو اچھا کہیں یا بُرا۔ سوال یہ ہے کہ اُن کو بُرا کہنے سے فائدہ۔ اُن کو جو کچھ کرنا تھا۔ وہ کر گذرے۔ وہ اپنی غلط کاریوں کا کفارہ دینے تو اب آ نہیں سکتے۔ ہم اس عیب جوئی میں وقت کیوں خراب کریں بندہ نواز یہ اس عیب جوئی کا جواب ہے جو آپ ہم غریبوں کی کرتے رہے۔ یہ اس الزام کا جواب ہے۔ جو آپ ہم پر دھرتے رہے۔ ہم اپنے ساتھ انصاف کر رہے ہیں مرے ہوؤں کے ساتھ ناانصافی نہیں کر رہے۔ سچ مانئے ہم دل کی بھڑاس نکالنے کو یہ راز طشت از بام نہیں کر رہے۔ ہم آنے والی نسلوں کو بامِ ترقی پر لے جانے کے لئے اپنے ہاتھ آلودہ کر رہے ہیں۔ ہم یہ برائیاں آپ کی اور اپنی اولاد کے لئے اپنے سر لے رہے ہیں۔

بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ صرف قلعۂ معلےٰ میں خرابیاں تھیں۔ اور ہمارے

عوام اُن عیوب سے قطعًا پاک تھے۔ یہ صحیح نہیں۔

منصفِ ازل ایک کی غلط کاریوں کی سزا ایک ہزار کو نہیں دیتا۔ اگر حاکم وقت اس کے متعلقین اور عمّال بد اعمال ہو گئے تھے تو عذاب صرف ان تک محدود رہتا۔ سزا صرف اُن کو دی جاتی۔ عاملانِ قضا و قدر اُن کو پا بجولاں کرتے۔ غلامی کا طوق سارے ملک کو نہ پہنایا جاتا۔

ہم سب ایک حمام میں اور ایک رنگ میں تھے۔ علیٰ قدر مراتب اور علیٰ قدر دست رس۔

جیسا راجہ ویسی پرجا۔ اَلنَّاسُ عَلیٰ دِینِ مُلُوکِہِم۔ ملک میں بداطواری اور عیاشی کی ہوا چل رہی تھی۔ وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس مرضِ عام سے نہ شاہ بچا نہ گدا۔ نہ امیر مامون نہ غریب مصئون۔

کام دیوتا ہولی کھیل رہا تھا۔ پچکاریاں چلاتا۔ چھینٹے اُڑاتا۔ بدمستی کا مینہ برساتا مست بناتا مستانہ وار پھر رہا تھا۔

اس رنگ میں سب رنگے تھے۔ اس محفل میں سب ننگے تھے۔ عریانی عیوب کی پردہ دار تھی۔ نشہ عریانی کا ستر پوش۔ دولت ستار عیوب۔ طاقت دولت کی ضامن۔

عشرت کی دیوی شب ماہ میں کتاں کا لباس پہنے کھڑی تھی۔ دست ہوش اُسے تار تار کر رہا تھا۔ تاروں بھری رات سر پر چھائی تھی۔ فلک پیر تیر پر تیر چلا رہا تھا۔ وہ اس کو شہاب ثاقب سمجھ رہے تھے۔ موتیوں کی نچھاور تصور کر رہے تھے۔ عقلوں پر سیاہ کاریوں کے پردہ پڑے تھے۔

پردہ در کو پردہ دار سمجھے بیٹھے تھے۔ موت کو نیند سے تعبیر کر رہے تھے۔ غلامی کو آسائش سمجھ بیٹھے تھے۔ بے دست و پائی کو سکونِ حیات۔ پشتِ مار کی گل کاریوں میں محو اُس کے سم قاتل کو بھول گئے تھے۔ زہر اپنا کام کر گیا۔ مار گزیدہ سوتے سوتے مر گیا۔

سماج کی یہ مسموم نعش کھاد بن گئی۔ پھر جو نسل اس زمین سے مستفید ہوئی اس زہر کے اثرات نامعلوم طریقہ پر قبول کرتی رہی اور کمزور ہوتی گئی۔ مریض بچے اپنے حال زار سے نالاں تھے دوسرے توانا و تندرست ہم عمروں کو دیکھتے اور ان پر رشک کرتے۔ آخر کار خرابیوں کی وجہ معلوم ہوئی اور ایک نسل نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ اس متعفن مسموم نعش کو اکھاڑ کر

پھینک دیں۔ آنے والی اور موجودہ نسل کو دکھا دیں جتا دیں اور سمجھا دیں کہ یہ نقش تمہارے ان بزرگوں کی ہے جن کو عیش وعشرت تن آسانی۔ سہل انگاری اور نفسانیت کی ناگن نے ڈسا تھا۔ تم اس سے بچنا اور اپنے دیس کو اس کے جراثیم سے پاک کرنا۔

اگر گذشتہ نسلیں اپنے کئے کا کفارہ دے سکتی ہیں تو صرف اس طرح کہ اپنے عیوب بتا دیں اپنے مکروہ زخم کھول کھول کر دکھا دیں تاکہ ان کی اولاد آگاہ ہو جائے اور اپنی حفاظت کرے۔

واقعات تاریخ پر پردہ ڈالنا مریض اور اس کے اعزّا سے حقیقت مرض چھپانا ہے۔

صحیح کہ باپ کے عیب بیٹے کو اور دادا کی غلط کاریاں پوتے کو سُنانا۔ اچھا نہیں لگتا۔ لیکن یہ دوا کی تلخی ہے۔ اُسے گوارا کرنا بہتر اور اس سے گریز ہلاکت کا باعث۔

ہم جو آج بڑوں کے کئے کو تک اگٹ رہے ہیں۔ اس سے ہم کو خوشی نہیں ہوتی۔ جس طرح وہ آپ کے بزرگ ہیں ہمارے بھی بزرگ ہیں۔ ہم کو ان کے پوشیدہ نامہ اعمال کھولنے میں مزا نہیں آتا پر کیا کریں۔ ہم پر قیامت ٹوٹی ہے۔ تب ہم نے یہ حشر بپا کیا ہے۔

گڑے مردے اکھیڑنا خوش آیندہ مشغلہ نہیں۔ یہ وہ کام ہے جو آپ انجام نہ دے سکے۔ پر کیا کریں ہم اپنی اور آپ کی اولاد کے لئے خاکِ وطن کو ان نقشوں سے پاک کر دینا چاہتے ہیں۔ جو زمین میں زہر پھیلا رہی ہیں۔ ہم پر آنے والی نسلوں کا ایک حق ہے۔ اس سے سُبک دوش ہونا چاہتے ہیں۔

ہم آپ کے روبرو خواہ روسیاہ ہو جائیں لیکن داورِ محشر کے روبرو سرخرو جانا چاہتے ہیں وما توفیقی الا باللہ۔

بندہ نواز۔ عدالت انتہائی سزا انتہائی جرم پر دیتی ہے۔ دیوان قضا وقدر کا بھی یہی دستور ہے۔ کسی ملک وملت کے واسطے بڑی سے بڑی سزا اس کی آزادی صلب ہو جاتی ہے پس جس وقت ہم سے حکومت لی گئی اور غلامی کی لعنت ہم کو دی گئی ہم بڑی سے بڑی سزا کے مستحق ہو گئے تھے۔ ہم اخلاقی اور ملی جرائم کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ یہ سمجھنا کہ دورِ زوال ابھی ختم نہیں اور اُس کو لامتناہی مستقبل پر ڈال دینا ایسی غلطی ہے جس سے خدا ہم کو آپ کو اور ہماری اولاد کو حفظ وامان میں رکھے۔ ہر کمالے را زوالے بر زوالے را کمال۔ انتہائے زوال

کے بعد یا موت ہے یا عروج۔ بندہ نواز دورِ زوال اپنی حد کو پہنچ کر غدر پر ختم ہو گیا اور چونکہ ہم من حیث القوم ختم نہ ہوئے اور آج بھی بفضلہ ہماری ملّی زندگی موجود ہے۔ پس قانونِ قدرت اور دستورِ فطرت کے مطابق دورِ عروج شروع ہو گیا۔ اور ہم للہ الحمد اس شاہ راہ پر بے سپر رفتار سست ہے۔ قدم چھوٹے چھوٹے اور لڑکھڑاتے ہوئے پڑ رہے ہیں، کیا کریں۔ پابجولاں ہیں چلتے ہیں گرتے ہیں۔ زنجیریں کھینچ لی جاتی ہیں۔ عمّال قیدی کو گریز پا کر سلسلۂ سلاسل سخت سے سخت تر کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا شکر ہے کہ یہ نسل آرزوئے پرواز سے محروم نہیں۔

آپ اس کو دورِ زوال کہتے ہیں جب کہ ہم نے انتہائی پابندیوں کے باوجود سخت ترین زنجیروں کے ہوتے ہوئے ترکِ موالات کی تحریک سے حکومت کی بنیادیں ہلا دیں۔ آپ اس دور کو دورِ زوال کہہ رہے ہیں جب کہ ہم نے اس بے دست و پائی پر بھی استبداد کے ہاتھ پیر پھُلا دئیے۔ آپ اس دور کو دورِ زوال کہہ رہے ہیں، جبکہ ہم نے ایسے قوانین کے ہوتے ہوئے جن کی رو سے چار کا سر جوڑ کر بیٹھنا ممنوع ہے۔ علی برادران جیسے سردار پیدا کیے۔ قوم میں احساسِ ملّی پھونک دیا۔ ہم نے اس عہد میں جبکہ دستورِ زبان بندی ایک مستقل قانون ہے وہ کچھ کہا جسے سُننے کے حاکم کے کان عادی نہ تھے۔ بزرگ من آپ غلطی کر رہے ہیں۔ آپ اپنے اور ہمارے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ یہ دورِ زوال نہیں۔ دورِ زوال وہ تھا۔ جبکہ ارتھیاں بنا بنا کر باوٹے پر روٹیاں بھیجی جا رہی تھیں۔ چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کے لئے وطن فروشی ہو رہی زر پرست سپوتوں نے قوم کو مردہ سمجھ لیا تھا یہ انھوں میں روٹیاں نہیں جاری تھیں گندم نما جو فروش قوم کا جنازہ نکال رہے تھے۔ اُنھوں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ ملت مر چکی اس کی ہڈیاں بیچی جا سکتی ہیں۔ ان کو یہ نہ معلوم تھا کہ قوم میں صور پھونکنے والے پیدا ہوں گے۔ اس مردہ میں جان پڑے گی۔ اور ان کے اعمال ان کی اولاد کے سامنے لاکھڑے کئے جائیں گے۔

دورِ زوال وہ تھا جب کہ مفتیٔ وقت جہاد کے فتوے پر دستخط کرتے ہوئے "بالخیر" کو "بالجبر" سے بدل دیتے تھے۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔

ہم اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن رہے۔ ہم خود ستائی نہیں کر رہے۔ مولانا حالی بھی غدر کے

بعد کی بابت کہہ رہے ہیں۔

حوادث نے اُن کو ڈرایا ہے کچھ کچھ — مصائب نے نیچا دکھایا ہے کچھ کچھ
ضرورت نے رستہ دکھایا ہے کچھ کچھ — زمانہ کے غل نے جگایا ہے کچھ کچھ

ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سوتے ہیں کچھ کلبلانے لگے ہیں

کہا جاتا ہے کہ باغی پوربیہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کی مدد کرنے نہیں آئے تھے۔ ان کو اپنا سردار تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کا مذاق اُڑاتے تھے اور بقول حضور بہادر شاہ۔ شاہ کے دونوں کان پوربیوں کے دوا گالدان بنے ہوئے تھے

بندہ نوازیہی پوربیہ جب جمنا کا پل پار کر کے دلی پہنچتے ہیں تو مثمن برج کے نیچے آن کھڑے ہوئے تھے۔ سلامی دی تھی۔ حضور کو بادشاہ مانا تھا۔ اپنی سرداری پیش کی تھی۔ جان نثاری پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اپنی عرض داشت گذاری تھی۔ لیکن ادھر سے جواب دیا گیا۔ کہ تم سے کس نے کہا کہ میں بادشاہ ہوں۔ میں تو فقیر گوشہ نشیں ہوں۔ اپنے بال بچوں کو لئے اس موروثی حویلی میں پڑا روٹی ٹکڑا کھا رہا ہوں۔ سپاہ کے روبرو بے دست و پائی۔ فقیر منشی اور کم ہمتی کا اظہار کیا گیا۔

اپنا حکم ان پر نافذ کرنے سے انکار کیا۔ دنیا نے ان کا حکم ان پر نافذ کر دیا۔ حکومت آخری دفع دروازہ پر خود آئی لیکن مایوس واپس گئی۔ حاکم نہ بنے محکوم بننا پڑا۔ دامن حکومت مردانہ وار نہ پکڑا وہ دامن چھڑا کر چلی گئی۔ ان پوربیوں پر اپنی کمزوری پست ہمتی ظاہر کر دی ان کی نظروں میں حقیر ہو گئے اس کے باوجود پوربیہ برابر حکم مانتے رہے۔ قیدی قلعہ میں داخل کئے جاتے تھے۔ شاہ وقت کے ملازمین کی تحویل میں دئے جاتے تھے۔ شاید حضور بہادر شاہ کے عہد حکومت میں یہ پہلا ڈھنڈورا تھا۔ جو ان الفاظ پیٹا گیا۔ خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم بادشاہ کا" اور یہ باغیوں نے پٹوایا تھا اس سے پہلے منادی کے الفاظ یہ ہوتے تھے۔ خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم سرکار کمپنی بہادر کا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوربیہ شاہ کو شاہ مانتے تھے۔

شاید آپ کو علم نہیں کہ شہر پناہ پر گولہ باری ہو رہی تھی اور جناب حکیم احسن اللہ خاں صاحب

دیوان خاص میں یا بدیع العجائب بالخیر کی تسبیحاں پڑھوا رہے تھے۔ یہاں امام حکومت بدلا جارہا تھا۔
ہر سخن موقع وہر نکتہ مقامے دارد اس وقت کے لئے تلوار تسبیح تھی۔ میدان کارزار مصلےٰ اور کاسۂ سرخشتِ نماز۔ خون سے وضو کرکے سرخ رو ہونے کی ضرورت تھی
بندہ نواز۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں　　مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ایک واقعہ ہو تو بیان کروں۔ ایک واردات ہو تو سناؤں۔ ہر ہر قدم پر لغزشیں نظر آتی ہیں۔ غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ خیال کیجئے میگزین میں آگ لگ رہی ہے حضور بہادر شاہ نے بجھانے کا حکم دیا۔ آگ بجھا دی گئی۔ ابھی لاانتہا سامان حرب بغیر علا موجود تھا۔ اسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا۔ دو تین روز بعد سُنا کہ وہ سامان بدمعاش لوٹ کر لے گئے۔ عالی قدر جس میگزین کو شاہی معتمد نے لٹ جانے دیا۔ جن پستولوں اور کارتوسوں کی حفاظت کا خیال شاہ وقت کو نہ آیا وہ اسلحہ اُن کے قول کے مطابق بدمعاشوں کے ہاتھ لگے۔ شریفوں کے خلاف استعمال کئے گئے۔ ان ہتھیاروں سے ہمارے آپ کے گھر لوٹے گئے۔ وہ گولیاں ہمارے بڑوں کے سینوں کے پار ہوئیں غضب خدا کا بھری میگزین بغیر پہرہ چوکی کے چھوڑ دی۔ تیمور کی اولاد نے اس پر قبضہ نہ کیا۔ اُن کے بڑے ایک ایک تیر اور ایک ایک تلوار کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ یہ وجوہ تھیں جنھوں نے پوربیوں پر پوری طرح ثابت کردیا کہ یہ حکومت کے اہل نہیں نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا۔
دنیا میں تخت ہے یا تختہ۔ حکومت ہے یا محکومیت۔ ان دو کے درمیان کوئی درجہ نہیں۔ یا تو تن بہ تقدیر تیغ بدست تخت شاہی پر جگہ بنائیے یا قعر مذلت میں گر جائیے۔ انھوں نے آخر الذکر کو اختیار کیا۔

صحیح کہ ان واقعات کے سامنے آنے سے ہماری خوش اعتقادی کی بنیادیں ہل گئیں۔ بزرگ داشت لرزہ براندام ہوگئی۔ ماضی پرستی کے جو قلعہ اور حصار ہمارے گرد کھڑے تھے۔ اُن میں زلزلہ آگیا۔ لیکن اگر یہ زلزلہ ہماری اولاد کو جگا جائے تو خدا گواہ ہے کہ نہایت مبارک زلزلہ ہوگا۔ ہماری آنکھوں پر تعصب اور عصبیت کی رنگین عینکیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اُن کو ایک دم کھینچ لیا گیا۔ اور ہم نے برہنہ چشم روز روشن مشاہدہ کیا۔ آنکھوں پر گراں گذرا طبیعت نے

جھرجھری لی۔ لیکن حقیقت شناس نظریں اس گرانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہیں۔
کہا گیا ہے کہ آج کل کے لوگ شکسپیر مکولے اور ملٹن کو جانتے ہیں۔ حافظ سعدی اور منوچہر دامغانی سے واقف نہیں۔ کالی داس تلسی داس اور والمیک سے بے بہرہ ہیں۔ للّٰلہ اس درجہ تعصب سے کام نہ لیجئے۔ خدا کے لئے ہمارے ساتھ ایسی ناانصافی نہ کیجئے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آج جو ہر سال لاکھوں کی تعداد میں نوجوان بی اے اور ایم اے پاس کرتے ہیں ان میں سے تقریباً اسی فی صدی۔ بی۔ اے تک عربی فارسی یا سنسکرت پڑھتے ہیں اب ذرا یہ فرما دیجئے کہ وہ طالب علم ان نصاب ہائے تعلیم میں حافظ۔ سعدی۔ عنترہ اور والمیک کو نہیں پڑھتے تو کیا شکسپیر اور مکولے کو پڑھکر فارسی عربی سنسکرت میں پاس ہو جاتے ہیں۔ عالی قدر ہم اپنوں سے بھی واقف ہیں اور غیروں سے بھی۔ ہم مولانا روم کے روبرو بھی زانوئے ادب طے کرتے ہیں۔ ہم حافظ شیراز سے بھی بیعت رکھتے ہیں۔ ہم حضرت سعدی کی گلستاں اور بوستان سے بھی پھول چنتے ہیں۔ ہم والمیک کی ڈرامہ نگاری سے بھی واقف ہیں اور شکسپیر سے بھی آشنا۔
ہاں پیش رفتگان نہ ادھر کے تھے نہ اُدھر کے نہ اپنوں کو جانتے تھے۔ نہ پرائیوں کو۔ رنڈیوں کے گھر ان کے مکتب تھے۔ کتاب عیش نصاب۔ دخت رزاستانی اور مقویات تازیانۂ تادیب۔
بندہ نواز ہم کو جاہل مطلق اور ان کو فاضل اجل سمجھنا ہیں کیا کہوں کہ کس ذہنیت کا نتیجہ ہے۔
اجازت دیجئے کہ میں اس دور کی تعلیمی کیفیت اور درسگاہوں کی حالت جناب کی خدمت میں پیش کروں۔ محترم من ہمارے محلوں کی مسجدوں میں جمعرات کی روٹیوں کے طالب۔ طالب علم ملّا لڑکوں کو کلام مجید بغیر معنی پڑھایا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض ہونہار حافظ ہو کر نکلتے تھے۔ کچھ ناظرہ پڑھ لیتے تھے اور اکثر کا دل دو چار دن بعد تعلیم سے اچاٹ ہو جاتا تھا۔ وہ خیر سے ڈنڈے بجاتے تھے یہ تھی وہ تعلیم جس کی بنا پر ان کو عالم بتایا جاتا ہے اور جس کی حقیقت سودا کے اس شعر سے ظاہر ہوتی ہے۔

جیسے سبحان من یرانی پر   لڑکے مکتب کے سب کہیں آمین

مزید برآں چند مدرسہ مذہبی تعلیم کے قائم تھے۔ معدودے چند فارغ البال علماء اپنے اپنے گھروں پر بیٹھے سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھتے تھے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اس کے

آگے آیتہ بھی۔ اب فرمائیے اس دور کے بزرگ ماں کے پیٹ سے پڑھے لکھے نکلتے تھے یا بقول شخصے خدا کا لب چاٹ لیا کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ تو درکنار وہ تو ایسا دورِ جہالت تھا کہ نوشت و خواند سے آشنا خال خال نظر آتے تھے۔

بہر نوع اس حقیقت سے تو میرے بزرگ انکار نہیں کر سکتے کہ جتنے عرصہ میں اس زمانہ میں ایک سطر لکھی جا سکتی تھی ہم آج اتنی فرصت میں ایک کتاب چھاپتے ہیں سارے ہندوستان کے خوش نویس مل کر جتنے عرصہ میں ایک لکھ سکتے تھے ہم آج اُتنے عرصہ میں اسی کتاب کی ایک لاکھ جلدیں نکال پھینکتے ہیں۔ اس کے جواب میں شاید کہا جائے گا کہ چھپ سکتی ہیں لیکن آپ لوگ اس رفتار سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ بندہ پرور اگر کتابیں چھپتی نہیں اور بکتی نہیں تو یہ ہزاروں چھاپہ خانہ والے لاکھوں روپیہ کی مشینیں لگائے کیوں بیٹھے ہیں۔

آج ہمارے زمانہ میں نوشت و خواند اتنی ہے کہ روزمرہ جو کاغذ ردی کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ آگ سلگانے اور پیسہ پیسہ کی پڑیاں باندھنے کے کام آتا ہے۔ آج جتنا لکھا ہوا صبح کے ایک گھنٹہ میں ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔ اُتنا ان کے زمانہ میں صدیوں میں نہ لکھا جاتا تھا نہ پڑھا جاتا تھا۔ یہ روزمرہ کی حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان کو دیکھنے کے بعد بھی آپ ان کو تعلیم یافتہ اور ہم کو جاہل کہیں تو ہم اس کو اپنی شومئ قسمت پر محمول کریں گے۔

ہم تیرہ بخت سیاہ کاروں پر جو سب سے بڑا الزام عائد کیا جاتا ہے وہ مذہب سے دوری کا ہے۔ بڑوں کی رائے میں ہم مذہب سے بہرہ مند نہیں۔ ہم کج رو اس راستہ سے بالکل بھٹک گئے ہیں۔ جس پر ہمارے ہادی خیر البشر نے ہم کو لگایا تھا۔ پیش رفتگان مذہب سے واقف تھے ہم اس سے قطعاً نا آشنا۔ وہ راہ حق پر بے سپر تھے ہم طریق باطل پر گام زن۔ وہ خدا کو پہچانتے تھے۔ ہم اُس ذات پاک کو بھولے بیٹھے ہیں۔ وہ اس کے فرماں بردار تھے ہم اس کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔

اگر یہ سچ ہے تو ہم اس مجیب الدعوات کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ وہ قادرِ مطلق ہماری ننگ اسلام نسل کو وہ سزا دے کہ ہم آنے والی نسلوں کے لئے موجب عبرت بن جائیں شاید اس طرح ہماری عاقبت سدھر جائے اور اگر ایسا نہیں تو خدا ہمارے مخالفین کو توفیق عطا

فرمائے کہ وہ ہماری خوبیوں پر بھی نظر رکھیں۔ کاش وہ اس فلسفہ کو سمجھیں کہ:

اک شرع مسلمانی اک جذب مسلمانی — ہے جذبِ مسلمانی سرِ فلک الافلاک
اے رہروِ فرزانہ بے جذب مسلمانی — نے راہ عمل پیدا نے شاخ یقیں نم ناک

ہم اُس ترک کو سچا مسلمان مانتے ہیں جو منادیٔ جہاد سن کر شراب خانہ سے تیغ بدست نکلتا اور میدان کارزار میں سر بکف پہنچ جاتا ہے۔ وہ امتحان میں ثابت قدم اترتا ہے کسوٹی پر سونے کا کس دیتا ہے۔ لاریب کہ وہ کندن ہے۔ ہم اس باشرع مولوی کے قائل نہیں جو تسبیح و مصلے لئے بیٹھا رہتا ہے۔ شریکِ جنگ نہ ہو۔ اُس کے کارزار پر میدانِ کارزار روتا ہے۔ میدان حشر میں مردِ مجاہد سرخ رو ہوتا ہے۔ اس دور میں جذبۂ اسلام نام کو نہ رہا تھا۔ شرع اسلام رنگ آمیزی کے ساتھ نام چار کو رہ گئی تھی۔

آپ نے بہتر کو بد تر بتایا۔ انصاف کا خون کیا۔ انصاف نے حقیقت عریاں کر دی۔ آپ نے ہماری بھلائیوں پر پردہ ڈالا دست عدل نے آپ کی پردہ دری کی۔ آپ نے ہم کو سیاہ کار بتایا زمانہ نے آپ کی حقیقت کو روز روشن میں عیاں کر دیا۔

ہم بُرے ہیں لیکن پیش رفتگان سے کم۔ ہم گناہ گار ہیں۔ لیکن گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتے ہیں بیشک ہمارے ہاں کلب ہیں۔ ہمارے ہاں ریس کورس پر بازی لگائی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے دور میں سرِ راہ پانسہ نہیں پھکتا۔ ہمارے گھر قمار خانہ نہیں۔ ہم شرابی ہیں کلال نہیں۔ ہم میں سے کچھ شراب پیتے ہیں۔ لیکن کشید نہیں کرتے ہمارے گھر گھر میں شراب کی بھٹیاں نہیں۔ ہم گناہ گار ہیں۔ لیکن اپنے شریک گناہ طبقہ کو بچوں کی نگاہوں سے دور لیجا کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ اولاد کو اُن کے پاس بھیجتے تھے۔

کہا گیا ہے کہ اس دور میں گناہ شرع کی ذہین آتا تھا۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ گناہ گاروں کو یہاں کچھ نہ کہا جاتا تھا اُن سے کوئی مزاحم نہ ہوتا تھا اور ان کو روزِ جزا کی سزا پر چھوڑ دیا جاتا تھا تو خیر ورنہ۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ حدودِ شرع قائم کئے جاتے تھے۔ تو مجھے دست بستہ یہ دریافت کرنا پڑیگا کہ اس وقت کتنی کچہریاں تھیں کتنی عدالتیں کے عدد کو توالیاں تھیں اور کے نفر برق انداز کتنے قاضی تھے اور کتنے مفتی جو شریعت کو نافذ کر رہے تھے۔ کیا معزز مقرر

بتا سکتے ہیں کہ اس وقت کتنوں کو دُرّہ لگائے جاتے تھے۔ اور اگر یہ سب کچھ تھا تو چاوڑی رشکِ قاف اور ہم رنگ خلد کیوں کر بنی تھی۔ یہاں شریعت نافذ کیوں نہ کی گئی۔

اگر گناہ شریعت کی زد میں آتا تھا تو ہمارے پچھلا کھلے بندوں عالمِ رنگ و بو کی سیر کس دل گردے سے کرتے تھے۔ بولیانِ زہرہ تمثال بیلوں کے تانگوں میں بیٹھ جامع مسجد کے گرد جلوہ کناں کیونکر دکھائی دیتی تھیں۔ سیاہ کار بنوا رڑ نیں نئی سڑک پر سرِ راہ شریعت کی مخالفت کا بیڑہ اُٹھا کر کیوں کر بیٹھتی تھیں۔ شریعت نافذ تھی تو آتش خوروں کو شراب کہاں سے دستیاب ہوتی تھی۔ سرِ راہ شارعِ عام پر کیوں بکی جاتی تھی۔ بھنگ کی تو افسکس طرح عام تھی۔ فلک سیر کس طرح ایجاد ہوئی۔ میرے ناقص خیال میں یہ کہنا کہ اُس وقت شریعت نافذ تھی۔ شریعت کی توہین کرنا ہے۔

جنابِ صدر میں محترم مقرر کی خوش بیانی کا قائل ہوں۔ طبعِ نکتہ رس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں لیکن کیا کروں۔ ان حقائق کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں مان سکتا کہ اس وقت گناہ شریعت کی زد میں آتا تھا۔

محترم مقرر نے فرمایا ہے کہ جب تک ان بہادروں کے دم میں دم رہا اور آخر میں تلوار وہ دلی کے چپہ چپہ کے لئے لڑتے رہے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اس ناچیز نے تصویر کا ایک پہلو پیش کیا ہے اور نہایت رنگ آمیزی سے کام لیا ہے۔ دوسرا رخ محترم و معظم میرے بزرگ تحریک کے مخالف نے دکھا دیا ہے اور کچھ ایسا نظر فریب رنگا ہے کہ آنکھیں الجھ کر رہ جاتی ہیں طبائع مسحور ہو جاتی ہیں۔ مغرب سے رنگِ شفق لاکر سینۂ قرطاس سرخ کر دیا ہے۔ صفحۂ تاریخ کو شنگرفی رنگ دیا ہے۔ مجھ کم بضاعت کو اس سحرکاری کے اثرات دور کرنے ناممکن ہو جاتے اگر اُس دور کے لوگ خود اپنا خاکہ نہ کھینچ جاتے۔

مرزا غالب ان ہی جان بازوں کی بابت رقعات میں تحریر فرماتے ہیں کہ شہدے گنڈے بدمعاش شہر میں لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ شرفا غریب کالوں اور گوروں کے ہاتھوں ناکردہ گناہ مارے جا رہے ہیں۔ داستانِ غدر کے مصنف جو اس وقت دربارِ شاہی میں بڑے عہدے پر سرفراز تھے۔ جگہ جگہ فرماتے ہیں کہ ناہنجار نابکار بائی غدار لڑتے مرتے پھرتے ہیں شریف اپنے گھروں میں ابرو سنبھالے بند پڑے ہیں۔ یہی الفاظ حضور بہادر شاہ بھی ان لڑنے والوں

کی بابت استعمال فرما رہے ہیں۔ تاریخ کی اس شہادت کے بعد بھی اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ایک چپہ زمین کے لئے چیوٹ جی دار لڑمرے تو یہ ہماری خوش اعتقادی کا لاریب ثبوت ہوگا۔

جناب صدر میں ایک غلط فہمی صاف کر دینی چاہتا ہوں۔ اس زمانہ والوں کو مجموعی حیثیت سے بُرا کہنے سے میری یہ مراد ہرگز نہیں کہ ان میں اچھے تھے ہی نہیں۔ حقیقت ہے کہ نہ کوئی فرد بھلائیوں سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے نہ کوئی قوم خوبیوں سے قطعاً معرا۔ اس دور میں افراد میں خوبیاں بھی تھیں اور لوگوں میں بھلے بھی تھے۔ لیکن برائیاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اس نسل کو مجموعی حیثیت سے پست کہنا لازم آتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض خوبیاں محض افراد کو ارفع و اعلیٰ کرتی ہیں اور بعض قوم کو قوم بناتی ہیں اس دور میں ہم میں جو تھوڑی بہت خوبیاں رہ گئی تھیں۔ وہ اول الذکر قسم کی تھیں یعنی افراد سے متعلق قوم کو ارتفع پر لے جانے والی نہیں۔

معزز مقرر نے فرمایا ہے کہ کسی قوم کے اخلاق کی کمزوری زوال کا باعث نہیں ہوتی۔ تاریخ میں زیادہ مثالیں اس قسم کی ملیں گی کہ عیاش قوموں کو کامیابی ہوئی اور دیندار اور نیک قومیں پس پا ہو کر غارت ہوگئیں۔ دعویٰ بغیر ثبوت کے مانا نہیں جا سکتا۔ میرے محترم حضرت یاس نے صرف اتنا فرمایا کہ تاریخ مثالیں پیش کرتی ہے۔ کیا ہم ان مثالوں میں سے چند دریافت کر سکتے ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں تو تاریخ اس کے خلاف شہادت دے رہی ہے۔ دور نہ جایئے تاریخ اسلام اٹھا کر دیکھ لیجئے اس دعوے کا رد مل جائے گا۔ علاوہ ازیں اس سب کے جواب میں کلام الٰہی کی یہ آیۃ کافی ہے۔ اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا مِنْ عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن۔ (زمین کے وارث میرے نیکوکار بندہ ہوتے ہیں) یہی اس ناچیز کا دعویٰ ہے کہ جب وہ نیکوکار نہ رہے۔ یہ ورثہ ان سے چھین لیا گیا۔ اس آیۃ کریمہ کے بموجب یہ حقیقت ہے کہ وہ غلام کر دئے گئے۔ ان کی بداخلاقیوں بدخصالیوں اور بداطواریوں کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر وہ نیکوکار ہوتے حاکم رہتے۔ عبادی الصالحون میں نہ تھے۔ غلام بنا دئے گئے۔

معزز مقرر نے فرمایا ہے کہ وہ مسجدیں بنواتے تھے۔ ہم ان کے لئے لڑتے ہیں۔ یہ الزام صحیح ہے اور بڑا مبارک الزام ہے۔ ہم اس کے لئے لڑتے ہیں جو وہ ہمارے واسطے چھوڑ گئے۔ ہماری ان سے یہی لڑائی ہے کہ وہ لڑتے نہ تھے۔ تن آسانی۔ سہل انکاری اور عیش پرستی ان کو

عافیت کوشی کی طرف مائل کرتی تھی۔

بندہ نواز۔ عالم ہست و بود میدان جنگ ہے یہاں ہر قدم پر اپنے حقوق کے لئے لڑنا پڑتا ہے۔ ہر لحظہ و ہر لمحہ مرگ و زیست میں جنگ ہو رہی ہے۔ حیات و ممات میں تصادم ہے۔ حق و باطل میں چھڑی ہوئی ہے۔ روز و شب ایک دوسرے کے در پے ہیں۔ اس میدان میں لڑائی سے دم چرانے والا فنا کر دیا جاتا ہے۔ تیغ بدست اپنا راستہ کاٹتا نکل جاتا ہے۔

میدان جنگ میں جنگ سے پرہیز موت کو دعوت دینا ہے۔ عرصۂ کارزار میں عافیت کوشی اور امن پسندی حال زار کا باعث ہوتی ہے۔ یہاں اگر عافیت ہے تو تلواروں کے سائے میں۔ یہاں تیر قضا کو تیروں کی انیوں پر روکا جاتا ہے۔ تلوار کا وار تلوار پر لیا جاتا ہے۔ لیل و نہار اپنی تیغ و تبر لئے سر پر سوار اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ اس جابر و قادر کے سامنے اسلحہ ڈال دینا ہلاکت کے مترادف ہے۔ یہاں تو وار پر وار ہو رہا ہے جو وار کر جائے گا بچ جائے گا۔ جو امن چاہے گا۔ مارا جائے گا۔ انھوں نے جنگ آزادی میں اپنا ہاتھ روک لیا۔ غلام بنا لئے گئے وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔

جناب صدر۔ زن۔ زر۔ زمین کو عیاشی کے خزانہ کہا گیا ہے۔ بندہ نواز ان تینوں سے عبارت ہے متاع دنیا۔ اگر یہ عیاشی کا خزانہ ہوتی تو کلام اللہ میں یہ دعا نہ اترتی کہ رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً۔ بزرگ من متاع دنیا بھی ہمارے لئے ہے اور جزائے آخرت بھی۔ لہلہاتی کھیتیاں بھی ہمارے واسطے ہیں اور جنت کے باغ بھی۔ دنیا بھی ہمارے واسطے ہے اور آخرۃ بھی بشرطیکہ صراط مستقیم پر چلیں۔ اخلاق درست رکھیں۔ معیار اخلاق درست رکھیں۔ زن زر۔ زمین کو اگر سانپ بچھو اور اژدہے سمجھ کر ہم اُن سے بھاگ جائیں گے تو دنیا میں ذلیل وخوار ہوں گے عقبےٰ میں روسیاہ۔ ہم دنیا میں پیدا کئے گئے ہیں۔ دنیا پر قابو پانے کے لئے اس سے ڈر کر بھاگنے کے لئے نہیں۔ ہم اشرف المخلوقات ہیں اس عالمِ آب و گل کی ہر شے ہمارے لئے تسخیر کی گئی ہے اور ہم اس کے حق دار۔ یہ فرسِ ابلق روزگار ہماری سواری کے لئے ہے۔ ہم اس کو موڑیں گے راہ پر ڈال لیں گے۔ اس کی کج رفتاریوں سے گھبرا کر اپنا مرکب چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے یہ سمجھنا کہ زر۔ زن۔ زمین عیاشی کا راستہ دکھاتے ہیں بالکل غلط ہے۔ یہ صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کے لئے زادِ آخرۃ بہم پہنچاتے ہیں۔ ہاں کمزور راہ گیروں کو ڈگر سے بھٹکا دیتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ گذشتگان میں اک شاہانہ سی کچھ ٹھاٹھ تھا۔ بنجارہ لاد چلا تھا اور یہ اپنے ٹھاٹھ کی دھن میں بیٹھے انند کے تار بجا رہے تھے۔ محفل اجڑ چکی تھی خم صہبا ٹوٹ چکا تھا۔ یہ شکستہ خم صہبا لئے بیٹھے تھے۔ حکومت عزت دولت کنارہ کش ہو چکی تھی وہ ان کی پرچھائیوں سے ہم آغوش تھے۔ عروس سلطنت جا چکی تھی وہ نقش پا کو گلے لگائے پڑے تھے۔ کم ہمت تھے۔ ہاتھ بڑھا کر دامن نہ پکڑ سکے ڈرتے تھے کہ کہیں ہاتھ نہ کٹ جائے۔ یہ نہ سمجھتے تھے کہ اگر صرف خون کے چھینٹے بھی اس کے دامن پر پڑ جائیں گے تو شاید وہ کبھی اس ہاتھ کی طرف متوجہ ہو جس کو روکنے کی کوشش میں کاٹا گیا تھا۔

اُن کی سیاہ کاریوں کی بدولت ہم کو بختِ سیاہ مقدر ہوا وہ ریاست کر گئے ہم کو افلاس ورثہ میں دے مرے۔ عیش و عشرت کی سہاونی چاندنی راتیں گذار کر ہمیں روزِ سیاہ کے حوالے کر دیا۔ زرق برق چاندنی کی مسہریوں میں سیم ساقون اور گل تکیوں میں پڑے سناتے رہے۔ رئیس تھے۔ رئیسانہ ٹھاٹھ سے گذار گئے سب کچھ خاک سے لگا دیا۔ اپنے پس ماندگان کے لئے بستر خاک اور خار افلاس چھوڑ مرے۔ جو ٹھاٹھ دار بزرگ گرمیوں بھر خس خانوں سے باہر قدم نہ رکھتے تھے۔ ان کی اولاد تنار دھوپ میں سر پر ٹوکری لئے نان شبینہ کو محتاج در بدر پھرتی ہے۔ جن خوش پوشوں کے میلے کپڑوں کی مہک مشامِ جان کو معطر کرتی تھی۔ ان کی اولاد کے میلے کپڑوں میں سے۔ پسینوں کی ایسی بدبو آتی ہے کہ راہ گیر ان سے بچ کر راستہ چلتے ہیں۔ محفل میں لوگ ان سے دور دور بیٹھتے ہیں۔ حضور کے بقول جن بزرگوں نے برسائیں منائی تھیں ان کی اولاد موسلا دھار مینہ میں سر برہنہ بسر کرتی ہے۔ جن بزرگوں نے عالم رنگ و بو میں برسائیں منائی تھیں۔ ان کی بہوئیں ان کے پوتوں کو سمیٹے جاڑوں میں ایک پھٹا پرانا کمبل لپیٹے مامتا کی ماری سکڑے ہوئے جھونپڑے کے ایک کونے میں بیٹھی نظر آتی ہیں۔ جنھوں نے برسائیں منائی تھیں ان کے بیٹے رعد و باراں میں گھر کی ڈھتی ہوئی دیوار کو ہاتھوں سے کریدتے ہوئے دیکھے گئے ہیں کہ شاید مٹی کی ہنڈیا جس میں سوکھے ٹکڑے بھرے تھے۔ ثابت بچ گئی ہو۔

عیش کی عمارت محل کی تھی برسائیں منا گئے۔ عمارت ڈھا گئے۔ خود ٹھاٹھ کر گئے۔ ہم کو خاک بسر کر گئے۔

کہاجاتا ہے کہ ان میں وضعداریاں تھیں۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ نواب صفدر علی صاحب جناب کے در دولت پر نماز جمعہ کے بعد ایک مرتبہ تشریف لے آئے اور آپ نے آموں سے ان کی تواضع کی تو تادمِ واپسیں یہ دستور قائم و دائم رہے گا۔ بندہ نواز جس کو ہم ان کا ہنر سمجھتے ہیں۔ وہ درحقیقت دولت۔ بے فکری اور بے کاری کے کرشمہ تھے۔ ان لوگوں کے پاس بچا کھچا روپیہ۔ بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں باقی تھیں جھوڑ رہے تھے۔ فکر معاش سے بے فکر کاروبار سے عار رکھتے تھے۔ وقت بھی پیسہ بھی وضعداریاں نبھانے کو اور کیا چاہیئے۔ ذرا ان کی زندگی کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ نواب صاحب دن رات دیوان خانہ میں فروکش ہیں۔ مصاحبین اداشناس صحبت میں حاضر نہ کوئی کام نہ دھندا۔ خوش گپیاں ہو رہی ہیں۔ شطرنج جگت چل رہا ہے۔ ارباب نشاط جمع ہیں۔ سامان عیش مہیا۔ مہینہ کے مہینہ داروغہ صاحب سود و خیر ادا کر کرایہ لا دیتے ہیں۔ اس سے زائد ضرورت ہو تو قرض کی ماں نہیں مری۔ ان کی زندگی بھر کے لئے جائداد کافی ہے ماشاء اللہ نہایت خداشناس ہیں اولاد کو اللہ کے بھروسہ پر کنگال چھوڑ کر جائیں گے۔ اب انصاف سے فرمائیے ان کے واسطے وضعداری نباہنی کونسی مشکل بات تھی۔

برخلاف اس کے ہمارا حالِ زار ملاحظہ ہو۔ صبح سے شام تک پیٹ کا پٹن رزق کا چکر اولاد کا فکر نوکری کا تقاضہ۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند	تہی خمخانہا کردند و رفتند

پرانے ٹھیکرے بزرگ خاک سے لگ گئے۔ باپ دادا کی ہڈیاں بیچ دیں اولاد کے ہاتھ پیر عزت دولت آزادی اپنے عیش کی خاطر فروخت کر مرے۔ ہم کو تو وہی کنواں کھودنا وہی پانی پینا۔ جو دن بھر کمانا شام کو بال بچوں میں بیٹھ کر کھاتا۔ ہم وضعداریاں نبھائیں تو کیونکر۔ یہ صحیح کہ ہم ہیں آج بھی بفضل تعالیٰ متمول ہیں۔ لیکن اپنے دست و بازو کی کمائی سے۔ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جائداد سے نہیں۔ دن رات پیٹتے ہیں۔ جب شام کو سمٹتے ہیں۔ یہ کلیہ اس دور کے امیر پر بھی صادق آتا ہے۔ اور غریب پر بھی۔

ان حالات میں ہم پر یہ الزام کہ وضعدار نہیں اور ان کی وضعداریوں کے قصیدہ پڑھنا محض ظلم زیادتی اور اندھی ستائش ہے

کیا کریں ہم اپنی اور ان کی حالت دیکھتے ہوئے۔ اُن وضعداریوں کی حقیقت جانتے بوجھتے انھیں اچھا کہہ نہیں سکتے۔

بجا کہ آپ نے کی پرورش محبت کی مگر میں آپ کو پروردگار کہہ نہ سکا

صفحۂ تاریخ پر نگاہ ڈالیئے آپ کو تیمورِ تن تنہا قیدی نظر آئے گا۔ پھر وہی تیمور چند روز بعد تخت شاہی پر متمکن۔ ساتھی بچھڑ گئے تھے۔ ہتھیار چھن گئے تھے۔ آزادی سلب ہو گئی تھی۔ لیکن ہمت مردانہ کی کمند اور تیغِ شجاعت اس کے پاس تھی۔ کمند لگا قید سے نکلا تلوار سے راستہ کاٹتا تخت تک جا پہنچا۔

کلکِ وقائع نگار لکھتی ہے کہ تیمور کے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ نمک خوار نمک حرام بن گئے۔ دوست زمانہ کی طرح بدل گئے۔ لیکن ہمتِ مردانہ نے ساتھ نہ چھوڑا منھ نہ موڑا۔ تیمور خوارزم کے راستہ میں چند ساتھیوں کے ساتھ ایک چٹان پر کھڑا ہے۔ دور سے گرد و غبار اُٹھتا نظر آیا۔ فراست نے کہا۔ دریں گرد سوارے باشد۔ ہر کابان تیمور اپنے اپنے مرکبوں پر سوار ہو گئے۔ اور طوغے برلاس کو خبر لانے بھیجا۔ معلوم ہوا کہ توکل بہادر ایک ہزار سوار لئے باد و باراں کی طرح چلا آ رہا ہے۔ ساتھیوں پر ہراس چھا گئی لیکن روشن دماغ اس بدلی میں بھی اپنی کڑک چمک دکھا گیا۔ اس برق سامان کے ساتھ کل ہم جمعین ساٹھ سوار تھے اور سامنے سے ایک ہزار سواروں کا دل بادل چلا آ رہا تھا۔ تیمور نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کو تین ٹکڑیوں میں بانٹا۔ گو یہ گنتی میں کم تھے لیکن دلیری شجاعت۔ ہمت اور بے جگری ان کے ساتھ تھی۔ اس کھٹا ٹوپ ... سے اس طرح ٹکرائے کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ برق و رعد کی طرح چمکتے کڑکتے دشمنوں کو چیرتے جھساں گرے خون کا مینھ برسا دیا مقابل کے منھ پھیر دئے حتیٰ کہ شام ہو گئی اور علم بردار فلک طاقِ مغرب میں داخل ہوا۔

اب یہ فلکِ دلاوری کے سبعہ سیارہ تعداد میں سات رہ گئے تھے کہ دشمن کے پیر اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگا۔ ان بہادروں نے بھی اپنی راہ لی۔ بھوکے پیاسے تھکے ماندے ایک کوئیں پر جا نکلے۔ رات وہاں بسر کی۔ شب کی تاریں تیرہ بخت بلجی پیادہ تین گھوڑے لے بھاگے علی بیگ عریانی کو اطلاع ہوئی کہ تیمور معاونین کے انتظار میں صحرا میں پڑا ہے۔ وہ ایک روز

اچانک آن پڑا۔ تیمور کو گرفتار کر لے گیا۔ اور ایک ایسی جگہ قید کیا جہاں ہزار ہا موذی اور موذی حشرات الارض تھے۔ یہ پیغمبر شجاعت قید میں تھا اور ہمت مردانہ باہر کھڑی کہہ رہی تھی کہ۔

اول شکستہ باش کہ اوج سریر ملک ۔ یوسف پس از مجاورت قعر چاہ یافت

یہ یوسف تریپن شبانہ روز اس زنداں میں رہا۔ آخر کار نہتا وہاں سے نکل پہرہ داروں پہ ٹوٹ پڑا ایک کی تلوار چھین باقیوں کو قتل کرتا سر دربار علی بیگ کے سر پر جا پہنچا۔

اس مجسم شجاعت کی اولاد کو میجر ہڈسن رتھ میں سوار کروا مقبرہ ہمایوں سے شہر کی جانب لے جاتا ہے۔ یہ تین آل تیمور اور ایک ان کا کولہ ایک رتھ میں سوار ہیں۔ موت سر پر سوار ہے۔ جانتے ہیں کہ جاں بچ نہیں سکتی۔ اتنا نہ کر سکے کہ جان پر کھیل کر ایک کوشش کر مرتے۔ مرنا تو بہر کیف تھا کچھ کر مرتے یہ تو چار تھے اور رتھ میں سوار رتھ بان بھی اپنا۔ ان کا دادا تن تنہا قید میں سے نکل تخت پر جا بیٹھا۔ میں مانتا ہوں کہ پھر بھی مرتے۔ لیکن مرد کی طرح دو کو مار کر مرتے۔ دل کی نکال کر مرتے۔ خدا کی قسم اس مرنے میں بھی مزا تھا۔ مرتے اور بیشک مرتے لیکن نام کر مرتے۔ تیموری خون کا اثر دکھا مرتے۔ بڑوں کا نام جلا مرتے۔ مرے تو سہی مرنا تو مقدر تھا لیکن بڑوں کے نام کو دھبا لگا مرے صفحۂ تاریخ کو شنگرفی کی جگہ سیاہ کر ے۔

ان کے بڑے موت سے کھیلتے تھے ڈرتے نہ تھے۔ یہ موت کو ہوا سمجھنے لگے۔ ان کے بڑوں نے انسانی نعشوں سے قصر حکومت تیار کیا تھا۔ بریدہ سر کنگروں کی جگہ سجائے تھے سینوں کی چربی نیو میں دی تھی۔ خون سے گارا بنایا تھا۔ یہ خیر سے جیتے جی مردہ کی شکل نہ دیکھتے تھے۔ اپنے ماں اور باپ کی نعش کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔

ان کے بڑے مار کر مرتے تھے یہ موت کے نام سے ڈرتے تھے۔

انھوں نے تیغ خون آشام ہاتھ سے رکھدی تیغ بے دریغ روزگار نے ان کو خون میں نہلا دیا۔ انھوں نے قتل و غارت سے دامن بچایا۔ یہ غارت کر دئیے گئے۔ انھوں نے جنگ ختم کر دی۔ جنگ نے ان کو ختم کر دیا۔

یہ گل بے خار کے طالب تھے۔ کانٹا توڑ کر گل حاصل کرنا نہ جانتے تھے۔ زمانہ نے ایسا کانٹا مارا کہ بلبلا کر دم توڑ دیا۔ یہ بھول گئے تھے کہ۔

دھانِ دوست طلب می کنی بلاکش باش — کہ خار و گل ہمہ با یک دگر تو اند بود

انھوں نے فراموش کر دیا کہ صرف وہ جوان عروسِ سلطنت سے ہمکنار ہو سکتا ہے جو لبِ سوفار کو بوسہ دے۔ اس خود فراموشی کا نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ حکومت ان سے کنارہ کش ہو گئی آزادی نے دامن چھڑا لیا۔ زمانہ نے طوقِ غلامی گلے میں ڈال دیا۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس زمانہ کی مائیں بچوں کو کیوں کر بہلاتی تھیں۔ بندہ پرور جب کسی کا لال بگڑ جاتا۔ مچل جاتا اور سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ تو جاننے والی ماں بیٹے کو بہلانے اور منانے کے لئے کہتی تھی کہ آؤ ہم تم کو جانِ آدم دکھائیں۔ آپ کو معلوم ہے۔ پھر بچے کو کیا دکھایا جاتا تھا۔ دانہ گندم وجہ ابتذال البشر موجبِ عتابِ الٰہی۔

اس طرح روز یہ جانِ آدم دیکھتے دیکھتے۔ یہ جانِ مادر۔ روح و روانِ قوم بے اصل گیہوں کو اصلِ حیات سمجھنے لگتا۔ اور آئندہ زندگی میں گندم چاک داماں کے لئے دامانِ عزت تار تار کرا دیا۔

خدا گواہ ہے کہ رزق کی بے حرمتی مدِ نظر نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ انسان رزق کی خاطر خون پسینہ بہاتا ہے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جان جیسی عزیز چیز بھی گنوا دیتا ہے۔ لیکن للہ الحمد میں اس راز سے ناواقف نہیں کہ انسان اس بازی پر اگر نہیں لگاتا تو عزت نہیں لگاتا۔

ہماری دنیا کی ہر چیز رزق پر سے نثار کی جا سکتی ہے۔ اور رزق ہماری عزت پر سے قربان کر کے پھینکا جا سکتا ہے۔

اس دور میں ہم اس تفاوت کو بھول گئے تھے۔ فریب خوردۂ مجاز تھے۔ امتیاز کھو بیٹھے تھے۔ بندہ پرور اس زمانہ کی ایک کہاوت ہے کہ کسی غریب فاقہ زدہ رانڈ بیوہ کی بچی نے کچوری کی ضد کی۔ پیسہ پاس نہ تھا یہ نگوڑی کوکھ کی آگ ایسی بری بلا ہے، مامتا کی ماری ماں نے اپنی عزت بیچ کر بچی کی ضد پوری کی۔

اب فرمائیے جس نسل نے یہ تباہ کن اخلاق کش اور مبتذل کہاوتیں بنائیں۔ اس کی دماغی اور ذہنی کیفیت کی بابتہ کیا کہا جا سکتا ہے۔

خیال کیجئے ان بچیوں کی افتاد کا جو انِ مثلون اور کہاوتوں کی گود میں پل کر ماں بنی ہوں۔

اندازہ کیجئے اس قوم کا جوان ماؤں کی گود میں پلی ہو۔
عالی قدر۔ بارہا گفتہ ام و بارِ دِگر می گویم کہ ان باتوں کو ذرا ذرا سی باتیں نہ خیال کیجئے یہ شاخیں ہیں جو اصل کا پتہ دے رہی ہیں۔ یہ تخم ہیں جو درخت کی خبر دے رہے ہیں۔ یہ بیضیہ ہے ولے فی الحقیقت ایک نسل کا حامل۔
یہ روزمرہ کی باتیں ہیں جو ہماری گھٹی میں پڑتی ہیں۔ یہ آوازیں شیر مادر کے ساتھ ساتھ ہمارے دماغوں میں داخل ہوتی اور تمام عمر دماغ کو گونجتی رہتی ہیں۔
ماحول طبائع پر اپنا رنگ جماتا ہے۔ فضا اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ صحیح کہ فطرت نہیں بدلتی لیکن فطرتِ ثانیہ پیدا ہو جاتی ہے۔
غلط زندگی۔ مکدر ماحول۔ سال خوردہ تہذیب۔ کرم خوردہ تمدن نے ان کی دماغی قوتوں کو اس درجہ کج رو بنا دیا تھا۔ کہ صراطِ مستقیم پر چلنا تو درکنار۔ ادھر نگاہ بھی نہ جاتی تھی۔
اس دور کے انسان خدا کی بنائی ہوئی پتلیاں تھے۔ جن کو صناع تمدن نے اتنے عرصہ اپنے سانچوں میں رکھا تھا کہ قدرت کی صنعت کاری انسان کی ملمع کاری میں چھپ کر رہ گئی تھی۔
وہ کچھ ایسی بناوٹی فضا میں پل رہے تھے کہ حقیقت سے دور ہوتے جاتے تھے۔
واقعات تاریخ۔ مبتذل محاورہ اور کہاوتوں میں پوشیدہ ہو گئے تھے۔ ہماری عقلوں پر پردے پڑے تھے۔ عام جہل کی سنگین دیوار ہمارے اور ہماری تاریخ کے درمیان حائل تھی اور ہم کو اس ورثہ سے محروم کر رہی تھی جس کے ہم حقیقی حقدار تھے۔
وہ ان ماؤں کو بھول گئے تھے۔ جو اپنے غنچہ ذہن نونہال چمن قوم پر نثار کر دیتی تھیں۔
وہ ان ماؤں کو بھی بھول گئے تھے۔ جو اپنے لخت جگر میدان جنگ میں سے اپنے کندھوں پر لاد کر لاتی تھیں۔ ان ماؤں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ جو پیٹھ دکھانے والی اولاد کو دودھ نہ معاف کرتی تھیں۔ انھوں نے ان ماؤں کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ جو اپنی اولاد کے راہ حق میں کام آنے پر خوشیاں مناتی۔ شادیاں رچاتی تھیں وہ ان ماؤں کو بھی بھول گئے جو اپنے بچوں کو دولھا بنا کر میدان جنگ میں بھیجتی تھیں۔ اور اُن ماں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ جنھوں نے اپنے نورِ چشم کو میدان میں بھیجتے ہوئے۔ ان الفاظ سے ڈھارس دلائی تھی کہ بکرے کو جب قصائی ذبح کر دیتا

ہے تو پھر جسم کے کتنے بھی پارچہ پارچہ کر ڈالے۔ بکرے کو تکلیف نہیں ہوتی۔ بزرگ من حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اپنی والدہ حضرت ابوبکر صدیق کی صاحبزادی کے پاس جاکر رفقار کی پہلو تہی کا حال بیان کرکے حجاج سے مصالحت کرلینے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ ماں فرماتی ہیں کہ بیٹا اگر تم باطل پر تھے تو اب تک کیوں لڑے اور اگر تم حق پر ہو تو صداقت کی حمایت سب سے بڑی طاقت ہے۔ بیٹا میدان جنگ میں جارہا ہے ماں سے رخصت ہوتا ہے وہ لختِ جگر کو سینہ سے لگاتی ہیں فرماتی ہیں آج بدن غیر معمولی طور پر سخت کیوں ہے۔ بیٹا جواب دیتا ہے کہ میں نے دو زرہیں پہن رکھی ہیں حق پرست ماں کہتی ہیں۔ یہ شہدائے حق کا شیوہ نہیں۔ بیٹا ایک زرہ اتار ڈالتا ہے۔ میدان میں جاتا ہے۔ جان بحق تسلیم ہوتا ہے۔ نعش سرراہ بانس پر لٹکا دی جاتی ہے۔ ماں نیچے سے گذرتی ہے آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔ اللہ اللہ اس سوار کے پیر اب بھی زمین پر نہ ٹکے۔ پیش رفتگان نے ان ماں کو بھی بھلا دیا۔ جنھوں نے میدان جنگ میں رات کے وقت اپنے چاروں بیٹوں کو مخاطب کرکے کہا تھا۔

پیارے بیٹو! تم اپنی خواہش سے مسلمان ہوئے اور ہجرت کی۔ وحدہٗ لاشریک کی قسم کہ تم جس طرح ایک ماں کے بیٹے ہو ایک باپ کے بھی ہو۔ میں نے تمہارے باپ سے بد دیانتی نہیں کی اور نہ تمھارے ماموں کو ذلیل کیا۔ اور نہ تمھارے حسب ونسب میں داغ لگایا۔ جو ثواب عظیم خدا نے کافروں سے لڑنے میں مسلمانوں کے لئے رکھا ہے۔ تم اس کو خود جانتے ہو خوب سمجھ لو کہ آخرت جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس دارفانی سے بہتر ہے۔ خدائے پاک فرماتا ہے۔ مسلمانو! صبر کرو اور استقلال سے کام لو۔ خدا سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو۔ کل جب خیریت سے تم انشاء اللہ صبح کرو تو تجربہ کاری کے ساتھ اور خدا سے نصرت کی دعا مانگتے ہوئے دشمنوں پر جھپٹ پڑنا۔ اور جب دیکھنا کہ لڑائی زوروں پر ہے اور ہر طرف اس کے شعلے بھڑک رہے ہیں تو تم خاص آتش دانِ جنگ کی طرف رخ کرنا۔ اور جب دیکھنا کہ فوج غصہ سے آگ ہو رہی ہے۔ تو تم غنیم کے سپہ سالار پر ٹوٹ پڑنا۔ خدا کرے کہ تم دنیا میں مال غنیمت اور عقبےٰ میں عزت پاؤ۔

ان واقعات تاریخ کو بھلا دیا۔ اپنی روایتیں خاک میں ملا دیں اپنے اوراق تاریخ کو الٹ کر

نہ دیکھا ان کی قسمت اُلٹ گئی۔ جہل کی تاریکیوں میں رہنے لگے ان پر سیاہ بختی چھا گئی۔ مبتذل کہاوتوں میں پلے بروان چڑھے۔ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی تھی نہیں۔ مانوں ارمانوں سے پیدا ہوئے۔ چاؤ چونچلوں میں پرورش پائی تعویذ گنڈے گلے کا ہار رہے۔ مرنے جینے کا پرہیز۔ گھر میں موت ہو تو وہ سات گھر پرے بھیج دئے جائیں۔ کہیں بچہ پیدا ہو تو وہاں پھٹکنے نہ پائیں۔

بسم اللہ کے گنبد میں پالے گئے بسم اللہ غلط ہو گئی۔

ماں باپ کی غلط محبت اولاد کو موت سے نہ بچا سکی ہاں زندہ در گور کر گئی۔

وہ سوختۂ آتش صداقت مائیں جو اولاد کو آتش جنگ میں کود جانے کی تلقین کرتی تھیں نہ رہیں۔ دودھ کی جلی چھاچھ پھونک پھونک کر پلانے والی رہ گئیں۔

بے دھڑک دشمن کی صفوں میں گھس جانے کی نصیحت کرنے والی صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا سکھانے والی رہ گئیں۔ وہ یہ بھول گئی تھیں کہ شعلۂ حیات ایک نہ ایک دن بجھنا ہے۔ نام روشن کر کے کیوں نہ بجھے۔ غلط فضا نے دماغوں میں یہ بات جما دی تھی کہ موت کے گھر میں موت کے فرشتے ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھول گئی تھیں کہ انسان کی موت، انسان کی محافظ ہے۔ وہ یہ نہ سمجھتی تھیں کہ موت اور زیست توام ہیں۔ وہ اپنی اولاد کو اُس سے ڈراتی تھیں جس سے ڈرنا بے سود تھا۔ اس محافظ سے بھگاتی تھیں جو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آخری تاجدار نے اپنی سعی تو بہت کوشش کی، لیکن کیا کرتے حالات اس درجہ قابو سے نکل چکے تھے کہ وہ ان کو درست نہ کر سکے۔ بندہ نواز پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند۔ حضور بہادر شاہ تو فرما رہے ہیں کہ جد و جہد بیکار ہے۔ حکومت آل تیمور سے اب لے لی جائے گی۔ زبان پر بار بار یہ فقرہ آتا ہے کہ از تیمور تا ظفر۔ جگہ جگہ فرما رہے ہیں۔ کہ میں فقیر گوشہ نشین اپنے بال بچوں کو لئے ٹکڑا کھا رہا ہوں۔ میرے رزق کے ٹھیکرے میں ٹھوکر نہ مارو اور ہم آج یہ بات ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں کہ انھوں نے اپنی کرنی میں کسر نہ کی۔ مدعی سست گواہ چست قلعہ دار قبر پر مجاور بنے بیٹھے ہیں۔ اور ہم ان کو مجاہد

کے رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انکشافِ غیبی کی بنا پر جنگ و جدال بیکار بتا رہے ہیں۔ سالخوردگی کا عذر کرم خوردہ پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے تلوار ہاتھ سے رکھدی ہے۔ کمر کھولے بیٹھے ہیں! اور ہم اس پر کمر بستہ ہیں کہ اُن کو تیغ بدست میدانِ کارزار میں کھڑا دکھائیں۔

بخت خاں ہمایوں کی قبر پر اس نسل کے آخری تاجدار کو تاج سنبھالنے کی صلاح دے رہا ہے، اور وہ تاج سے بے خبر سر کی فکر میں پیرانہ سالی کا عذر پیش کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں بخت خاں تم صحیح صلاح دے رہے ہو۔ لیکن میں اب بہت بڈھا ہو گیا ہوں۔ اس عمر میں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔ اگر وہ اُس وقت ٹھوکریں کھا لیتے تو تاج تیموری اور لاج ہمایونی اغیار کی ٹھوکروں سے بچ جاتے۔ اگر وہ اس وقت ٹھوکریں کھا لیتے تو دلی کی جامع مسجد خانۂ خدا میں گھوڑے نہ بندھتے۔ اگر وہ اس وقت ٹھوکریں کھا لیتے تو آج ان کی اولاد آٹھ آٹھ آنے کے لئے آئے دن کچہری عدالتوں میں ٹھوکریں نہ کھاتی پھرتی۔ اگر وہ اس وقت ٹھوکریں کھا لیتے تو ان کے جوان بیٹوں کے سر ٹھوکروں سے بچ جاتے۔ اگر وہ اس وقت ٹھوکریں کھا لیتے تو شاید سارا ہندوستان ان ٹھوکروں سے بچ جاتا۔ جو اس کو روز کھانی پڑ رہی ہیں۔

اُنہوں نے ٹھوکروں کے ڈر سے راہِ عمل میں قدم نہ رکھا اور یہ سب سے بڑی ٹھوکر تھی۔ اس کا نتیجہ اُنھوں نے جیتے جی دیکھ لیا۔ اپنی اولاد کے کٹے ہوئے سر دیکھے، قید دیکھی۔ عدالت میں ملزم کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ گھر بار چھٹا۔ اپنے چھٹے خویش و اقارب سے جُدائی ہوئی۔ شاہی سے گدائی ہوئی۔ خدا کی قسم اگر جد و جہد کی راہ میں ٹھوکریں کھا کر مر جاتے تو اس سے بہتر تھا۔

تیمور تنِ تنہا کوئیں میں سے نکل کھڑا ہوا۔ ان کے پاس تو اس کی نسبت بہت کچھ تھا۔ ہاں ہمت مردانہ نہ تھی۔

تیمور کو ہمیشہ بشارت ظفر کی ہوئی۔ اور حضور ابو ظفر کو شکست کی یہ آخر کیوں۔ بندہ پرور وہ حکومت کرنے پیدا ہوا تھا، یہ محکوم بنے۔ وہ جفاکش تھا یہ عیش پرست۔ وہ مرد میدان تھا یہ شیر قالین وہ عمر جاوداں کا طالب تھا، یہ آسائش دو روزہ کے خواہاں، وہ سر دے کر سرداری لینے آیا تھا۔ یہ سرداری دے کر سر بچانے کے خواہش مند۔ وہ گھوڑے پر سوار راتیں گذار دیتا تھا، ان پر تن آسانی سوار تھی۔ وہ میدانِ جنگ میں نعشوں پر سر رکھ کر سو جاتا تھا۔ یہ پھولوں کی سیجوں گل تکیوں اور گرخوں

کے عادی۔ وہ جانتا تھا کہ

کسے بگردنِ مقصود دست حلقہ کند
کہ پیشِ تیرِ بلاہا سپر تواند بود

اور ان پہ گراں گذرتا تھا دامن نگاہ کا۔

زمانہ نے آنکھیں پھیر لیں، لیل و نہار چشمِ خشم سے دیکھنے لگے، پھر بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں، عیش و عشرت نے دستِ حنائی آنکھوں پر رکھ دیا تھا۔ خوابِ رنگیں دیکھتے دیکھتے قعرِ مذلت میں جا پڑے۔ پیرانہ سالی کا عذر کم ہمتی کی دلیل ہے۔ اور ہمارا اس کو مان لینا ہماری کم عقلی پر دلالت کرتا ہے۔ زمانہ پر قابو پانے والا دماغ سن و سال کے اثرات سے بالاتر ہوتا ہے۔ خنگِ ابلقِ لیل و نہار پر سوار ہونے والا مرد اس کی رفتار کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ جوانی میں تدبیر پیر کا حامل ہوتا ہے، اور پیری میں ہمت جواں رکھتا ہے۔ دیکھو ہلاکو خاں کو کس سن و سال میں لشکر کشی کر رہا ہے۔ دیکھو چنگیز کو قلعۂ فاجو پر کس عمر میں دھاوا بولا ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹو معلوم ہو جائے گا کہ حکومت کرنے والی طبائع مرتی ہیں بڈھی نہیں ہوتیں۔

اب ذرا اس کوشش کی بھی تفصیل سُن لیجئے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ آخری دور کے پہلے تاجدار تھے، جنہوں نے تاج و تخت سنبھالنے کی کوشش کی۔

بخت مخالفت میں توپیں داغ رہا تھا اور لال حویلی سے خط پر خط داغے جا رہے تھے۔ دستِ قضا دستاویزِ حکومت چھین خطِ غلامی دے رہا تھا، اور یہ بیٹھے خط لکھ رہے تھے۔ فرسِ سلطنت باگیں تڑا رانوں سے نکلا جا رہا تھا۔ اور یہ پیک پر پیک دوڑا رہے تھے۔ تعویذ گنڈے ہو رہے تھے۔ دم کئے ہوئے پانی پئے جا رہے تھے۔ وہاں قلمدانِ حکومت و بیرنلک کسی اور کو سنبھلوا رہا تھا۔ یہاں مرثیے لکھے جا رہے تھے۔ اگر اسی کا نام جد و جہد ہے۔ تو جناب حق بجانب۔ بزرگ من اگر تعویذ گنڈے ریوڑی، گٹے سے حکومت ملتی تو آج سارے پیر سریر آرائے سلطنت ہوتے۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ان کے بڑوں نے تیغ آبدار سے آبرو حاصل کی یہ دم کئے ہوئے پانی کے دم میں رہے۔

چشم بد دور کہ بالاتر ازیں ممکن نیست،

کبھی پیرانہ سری کا بے سر و پا عذر کیا جاتا ہے تو کبھی نصرتِ باطنی شکست کی خبر دیتا

ہے۔ ذاتی کشف وکرامت پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ حکمِ خدا کو پس پُشت ڈالدیا جاتا ہے۔ شاہِ وقت نے اپنے ذاتی القاء کو مانا اور کلام پاک کی اس آیتہ کو نظرانداز کردیا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًاہ کلام الٰہی کے مطابق جس پر بفضلِ تعالےٰ میرا آپ کا اور ہم سب کا ایمان ہے، اپنے کو کمزور سمجھ کر اعدائے اسلام کی غلامی قبول کرنے والے اپنے پر آپ ظلم کرنے والے قرار دے گئے ہیں۔ کیا ہم مسلمان بات کی پچ میں حکمِ الٰہی کو پسِ پشت ڈالدیں گے۔ کیا ہم حیلہ جو طبیعت کی بشارت پر اٰمنّا وصدقنا کہیں گے، اور کتاب اللہ کو ہاتھ سے دے دیں گے۔ للہ الحمد کہ ہم ایسا کرنے والے نہیں۔

بندہ نواز کمزوری کا بہانہ کر کے جنگِ حق میں حصّہ نہ لینے اور اپنا حق گنوا دینے پر جگہ جگہ لعنت آئی ہے۔ ایک جگہ بنی اسرائیل کی بزدلی اور جہاد سے جی چرانے کے بیان میں ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی قوم کو اللہ کی نعمتیں یاد دلاکر حکم دیا کہ تم ارضِ مقدّس میں داخل ہو، جیسے اللہ نے تمہاری میراث میں دیا ہے۔ اور ہرگز پیٹھ مت پھیرو۔ کیونکہ پیٹھ پھیرنے والے ہمیشہ نامراد رہا کرتے ہیں۔ مگر بنی اسرائیل پر دہشت بیٹھی ہوئی تھی اُنھوں نے کہا اے موسیٰ اس زمین میں تو ایک قوی بازو قوم ہے۔ ہم اس میں ہرگز نہ داخل ہوں گے۔ جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جایئں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم ضرور داخل ہو جایئں گے، آخر اس بزدلی کی بدولت قدرتِ الٰہی نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ چالیس برس تک دربدر خاک چھانتے پھریں، اور کہیں ان کو ٹھکانہ نصیب نہ ہو۔ اللہ نے فرمایا کہ جو زمین ان کے حق میں لکھی گئی تھی وہ اب چالیس سال کے لئے اُن پر حرام کردی گئی۔ اب وہ زمین میں بھٹکتے پھرینگے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب اُن کی پست ہمتی نے ان کو اپنی نگاہ میں کمزور کر دکھایا وہ درحقیقت کمزور تھے بھی یا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مخالفین کے پاس ہتھیار ہم سے بہتر تھے۔ بندہ پرور یہ غلط عذر ان کے سامنے چل سکتا ہے۔ جو حالات سے آگاہ نہ ہوں۔ جو تاریخ سے واقف نہ ہوں اسوقت جانبین کے پاس ہندوستان کے تیار کردہ ہتھیار تھے۔ اب کی طرح حاکم کے اسلحہ سات سمندر پار سے نہیں آتے تھے۔ علاوہ ازیں تعداد میں ہمارا ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا تھا ہم ٹڈی

دَل تھے وہ گِنتی کے۔ ہم لاتعداد وہ گِنے چُنے۔ نیز وہ پردیس میں پڑے تھے، ہم اپنے دیس میں۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے پر ہمارے شیر مرد وہاں بھی کچھ نہ کر سکے۔ مٹھی بھر سپاہ نے اُن جیوٹ، ہتھیار بندوں کے گلے میں غلامی کی زنجیر ڈال دی، جن کی بہادری کے آج ہم گیت گاتے ہیں جو ہمارے مقابلہ میں سورما بتائے جاتے ہیں

جب بُرے ہتھیاروں کا عُذر نہیں چلتا تو تنظیم کا ذکر آتا ہے، ہم منتشر تھے، مخالف منظم۔ ہم بکھرے ہوئے تھے، وہ یک جا۔ ہم بھیڑ تھے وہ سپاہ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس تنظیم کی کمی کے ذمہ دار ہم ٹھہرائے جائیں گے، یا وہ جو محلوں میں بیٹھے ملک کی حفاظت سے بے خبر، سپاہ سے بے پرواہ، رعایا کی دولت عیش وعشرت میں لٹا رہے تھے۔

حکومت ان کا ذریعہ عیش تھی۔ ذمہ داری نہیں، مسلمانوں کی سلطنت کو خدا کی امانت نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی آسائش کا آلہ کار بنا رکھا تھا۔ وقف کو ذاتی جاگیر سمجھ بیٹھے تھے،

سچ یہ ہے کہ بیش از رنگال ہتھیار بھی رکھتے تھے، اور ان کے استعمال کی رخصت سے بھی محروم نہ کئے گئے تھے۔ ان کے پاس سب کچھ تھا، ہاں جذبۂ حریت اور ہمتِ مردانہ سے بیگانہ تھے۔ بداطواریوں کی بدولت ان کی رُوحیں تحلیل ہو چکی تھیں، قلب مضمحل تلخیٔ غلامی سے آشنا نہ تھے، ذلتِ حکومت کام و دہن فراموش کر چکے تھے۔ قربانی کا جذبہ معدوم ہو چکا تھا۔ تن آسانی کا شکار تھے غداری اور ریاکاری رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی، صراط مستقیم سے بھٹک گئے تھے،

یہ ہیں اقوام عالم کے زوال کے باعث اور یہی ہمارے ادبار کا سبب تھے، ہتھیاروں کی کمی تنظیم کا فقدان جھوٹے بہانے ہیں جو خوئے بد تلاش کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حکومت کی بنیادیں تو ایک عرصہ سے کھوکلی ہو رہی تھیں، خاندانی سازشیں، گھن کی طرح لگی تھیں عمارت ڈھینے کو تیار کھڑی تھی، بس ایک دھچکے کی کسر تھی، دیکھنا یہ ہے کہ جس وقت وہ دھچکا لگا تو مکان کے حوالہ داروں نے آڑ و اڑ لگائی یا نہیں، اپنے بازوؤں پر چھت کو روکا یا نہیں، اپنی کمر دیوار سے لگا دی یا نہیں، یا اپنی جان بچا کر بھاگا، اور عمارت کو بچانے کی سرے سے کوشش ہی نہ کی یہ عمارت چونے مٹی کی نہ تھی، یہ عمارت اینٹ پتھر کی نہ تھی یہ عمارت خونِ شہیداں سے تیار کی گئی تھی۔ اس کی دیواریں جوانوں کی ہڈیوں سے بنائی گئی تھیں۔ اس کی

بنیاد قوم پرستوں کی نعشوں پر رکھی گئی تھی، اور اس ہی مال مصالحہ سے یہ عمارت قائم رکھی جا سکتی تھی۔ بنیادیں پھر خون مانگ رہی تھیں، سینوں کی چربی طلب کر رہی تھیں، وہ بیٹھ دکھا گئے۔ سینوں کی چربی دینے سے جی چرا گئے۔ جہاں لہو کی مشکیں درکار تھیں۔ وہاں چھینٹے دیئے۔ عمارت آن پڑی۔ یہی الزام ہے جو ہم ان کو دے رہے ہیں، اور یہی الزام آنے والی نسلیں ان کو دیں گی۔

علاوہ ازیں ہم کو IMMEDIATE CAUSE یعنی وجہ قریب کی طرف جانا چاہیئے۔ ورنہ سبب اور نتیجہ کا ایک سلسلۂ لامتناہی شروع ہو جائے گا۔ مثلاً خاندانی سازشوں کو لے لیجئے۔ اس کی مثال ہم اس ہی نسل اور اس ہی خاندان میں وسط ایشیا میں پاتے ہیں۔ ایساں بوغا خاں کی بیوی، سیتل بیش حاملہ مان لیگ کو خان کی غیر موجودگی میں دیس نکالا دیتی ہے۔ اور اس سے بھی قبل اس ہی ہوا و ہوس اور حسد کے نقائص ہم ہابیل اور قابیل میں پاتے ہیں، اور ان کو بہکانیوالا شیطان تھا جو خود حسد کا شکار ہوا، پس اس طرح کبھی کوئی ملزم قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ اور ہر ایک جرم انجام کار گناہگار اوّل کے سر تھوپ دیا جائیگا۔

ہر شخص مرنے کے لیئے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو غلط دوا دے کر مار دے تو اس سے باز پرس نہ ہو اس پر الزام نہ لگایا جائے۔ چونکہ مرنا مقدر تھا۔ موت اس کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ بندہ نواز یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اور ہر بات کا ذمہ دار کسی نہ کسی کو ٹھیرایا جاتا ہے۔ مانا کہ مریض ایک عرصہ سے بیمار تھا مانا کہ مرض پرانا ہو گیا تھا صحیح کہ پہلے ڈاکٹروں نے غلط علاج کیا اعزا نے علاج کی طرف توجہ نہ کی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جب آخری ڈاکٹر کے ہاتھ میں مریض گیا اس وقت وہ جاں بر ہو سکتا تھا یا نہیں، اس وقت تک مرض لادوا ہوا تھا یا نہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ ڈاکٹر نے صحیح تدابیر اختیار کیں یا نہیں۔

مریض جاں بلب کو خون کے انجکشن کی ضرورت ہے، اور ڈاکٹر میٹھا پانی کے انجکشن دیئے جاتا ہے۔ اس ڈاکٹر کی بابت یہ کہنا کہ بیچارہ نے اپنی سی تو بہت کوشش کی اگر انصاف کا خون کرنا نہیں تو کیا ہے۔ ڈاکٹر کے دروازہ پر مریض کے رشتہ دار جاتے ہیں۔ ڈاکٹر آنے سے انکار کرتا ہے۔ عذر یہ ہے کہ میں بڈھا بہت ہوں، عذر یہ ہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ مریض بچ نہیں سکتا۔ ان حالات میں کونسی عدالت ڈاکٹر کو ملزم اور مجرم نہیں قرار دے گی۔

انصاف کا دیوتا اندھا نہیں ہے۔ آج اندھے دیوتا کے پجاریوں کو آنکھوں والے کے سامنے آنا پڑا ہے، میزان کا پلڑا بتا دے گا کہ کون گراں قدر ہے، اور کون فرومایہ۔
ان دلائل سے یہ مدعا ہرگز نہیں کہ تمام بار کسی فرد واحد کے سر ڈالا جائے۔ اور تمام و کمال خرابیوں کا ذمہ دار اس کو ٹھیرایا جائے۔ ایک فرد یا چند افراد نہ قوم کو گرا سکیں نہ ابھار سکیں ملّت من حیث القوم بنتی اور بگڑتی ہے۔ اس تمام گفت و گو سے مدعا یہ ثابت کرنا ہے کہ راجہ پرجا شاہ و گدا سب اپنے اپنے معیار سے گرے ہوئے تھے۔ عام ذہنیت خراب و پست ہو گئی تھی۔ وہ نسل نہایت تیزی سے زوال اور انتہائے زوال کی طرف جارہی تھی
بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ شام کے بعد صبح ہوتی ہے۔ صبح کے بعد شام ہوتی ہے۔ گردش لیل و نہار یہی ہے۔ روشنی و تاریکی، نشیب و فراز، مدو جزر توام ہیں۔ نظام بدلا نہیں جا سکتا گردش گردون دوں، اس ہی کی متقاضی ہے۔ حکومتوں کے عروج و زوال کے باعث تلاش کرنا سعی لاحاصل ہے یہ خنگ اوہم و بازِ اشہب شب و روز انسان کی دسترس سے باہر ہے، فلک فریب کار ایک کو گراتا ایک کو ابھارتا اپنی چیرہ دستیاں دکھاتا رہتا ہے۔
مکرم بندہ۔ یہ عالم تکوین و ایجاد۔ عالم اسباب ہے، ہر چیز کا ایک سبب اور ہر علت کا ایک معلول ہوتا ہے۔ دستِ قدرت نے ہمکو قدرت عطا فرمائی ہے۔ لیل و نہار ہمارے عزم فلک پیما کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ صحیح کہ ہم گردش لیل و نہار نہیں روک سکتے۔ لیکن ہمّت مردانہ سے شبِ تار کو روز روشن بنا سکتے ہیں۔ مانا کہ رفتار فلک کے سدِ راہ نہیں ہو سکتے، تاہم اپنی رفتار بڑھا سکتے ہیں۔ ہم عناصر کے فرماں روا نہیں۔ عناصر ہمارے خدمت گار ہیں۔ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ کائنات عالم کی ہر شے ہم سے پست ہے، اور پستی بلندی پر حکومت نہیں کر سکتی، اسفل اعلےٰ پر تسلط نہیں جما سکتا۔

جن بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ حکومت جانی تھی، گئی۔ کسی کو اس کا ذمّہ دار ٹھیرانا غلطی ہے۔ میں انکی خدمت میں دست بستہ اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اپنے گھر کی حفاظت کیلئے ایک چوکیدار مقرر کر جاتے ہیں اور پھر گھر اس پہرہ دار کی بے عنوانیوں اور بداحتیاطیوں کی وجہ سے لٹ جاتا ہے تو کیا وہ اس نقصان کو قسمت کا نقصان سمجھ کر اس چوکیدار سے باز پرس نہ کرینگے۔

کیا وہ اس چوکیدار کو سخت و سست نہ کہیں گے۔ کیا وہ اس چوکیدار کو ذمہ دار نہیں ٹھیرائیں گے
بعینہٖ یہی مثال عائد آتی ہے، حکومت پر، وہ آنے والی نسلوں کی امانت ہے جو موجودہ نسلوں کو سونپی جاتی ہے۔ اگر وہ جوں کی توں ان تک نہ پہنچائی جائے تو ان کو باز پرس کا حق ہے اور پورا پورا حق۔
جناب صدر رد وقدح کی رَو میں جانبین نفسِ مضمون سے دور بھٹک گئے۔ اور بحث میں ایسا ہونا بھی ہے، مدعا محض یہ فیصلہ کرنا ہے کہ جماعت کی حیثیت سے، وہ، ہم سے بہتر تھے یا ہم ان سے بہتر ہیں صرف اس نتیجہ پر پہنچنا ہے کہ دورِ زوال ختم ہوا یا نہیں۔
دورِ زوال غدر پر اپنی انتہا کو پہنچ کر یقیناً ختم ہو گیا، اور اب دورِ عروج ہے، اور ہم بفضلہٖ راہ ترقی پر گام زن۔
دورِ زوال وہ تھا جب جان پر کھیلنے والے وحدہٗ لاشریک کو جان کا مالک و مختار جاننے اور ماننے والے اغیار سے جان بخشی کے وعدوں کے طلبگار تھے۔
دورِ زوال وہ تھا جبکہ حکومت کا نام تک آپ سے چھینا جا رہا تھا۔
دورِ زوال کی انتہا وہ تھی جبکہ نسلِ تیموری کا آخری تاجدار ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا۔
دورِ زوال وہ تھا جبکہ شہزادوں کے خون محرومِ انتقام رہے۔ یہ سمجھنا کہ دورِ زوال ابھی تک چل رہا ہے۔ روزِ روشن کو شبِ تار بتانا ہے۔
ہم اِن زخموں سے تڑپنے لگے ہیں جو سلاسلِ غلامی نے ہمارے جسم پر ڈالے ہیں۔ اپنی بے دست و پائی کا احساس ہو گیا ہے۔ اس جمود سے اُکتا گئے ہیں۔ گو ہم ابھی تک قفس میں ہیں۔ لیکن ہماری نظریں باہر کی آزاد فضا پر پڑنے لگی ہیں۔ ہمارے جسم اب تک قید میں ہیں، لیکن دل و دماغ آزادی کی ہوا سے آشنا ہو چلے ہیں گو ہم ابھی اڑ نہیں سکتے۔ تاہم آرزوئے پرواز پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری زندگی اسیری کے خلاف مسلسل احتجاج ہے۔ ہمارے دلوں میں آزادی کی چنگاری پیدا ہو گئی ہے، اور یقیناً وہ قفس کو پھونک کر رہے گی۔

اسیری میں جو گرمِ فریاد ہیں یاں — وہی آشیاں کرتے آباد ہیں یاں
قفس سے وُہی ہوتے آزاد ہیں یاں — چمن کے جنہیں چہچہے یاد ہیں یاں
وہ شاید قفس ہی میں عمریں گنوائیں — گئیں بھول صحرا کی جن کو فضائیں